تعلیم و تربیت

اپریل
2010















آگیا موسمِ بہار

نظم صفحہ 4


GOOD MORNING
Shezan
JAM / JELLY & MARMALADE
SHEZAN PURE FRUIT PRODUCTS
Shezan
MIXED FRUIT
JAM
Shezan
MANGO
JAM
Shezan
APPLE
JAM
Shezan
SWEET ORANGE
MARMALADE

CamScanner

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

69 واں سال 12 واں شمارہ

(رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی)

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

اپریل 2010ء

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: "موسم بہار"

قیمت فی پرچہ 25 روپے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

سلطان محمود غزنوی نے خربوزہ کاٹا اور اس کی پہلی قاش اپنے غلام ایاز کو پیش کی۔ ایاز اس عزت افزائی پر بہت خوش ہوا اور شکریہ ادا کر کے خربوزہ کھانے لگا۔ محمود نے دوسری قاش کاٹی اور خود کھانے لگا، لیکن فوراً تھوک دی اور حیرت سے ایاز کی طرف دیکھنے لگا جو اُس وقت تک خربوز کی پھانک کھا چکا تھا۔ محمود نے ایاز سے کہا۔

"خربوزہ تو بہت کڑوا ہے تم نے اسے مزے سے کھالیا، کیا یہ تمھیں کڑوا نہیں لگا؟"

ایاز نے نہایت ادب سے کہا۔

"خربوزہ تو کڑوا ہے، مگر آپ کی محبت میٹھی ہے۔ میں روزانہ آپ کے ہاتھوں مزے دار میٹھی چیزیں کھاتا ہوں، آج آپ کے ہاتھوں ایک کڑوی قاش ملی تو میں نے اس کا شکوہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

یہ سن کر محمود نے رشک بھری نظروں سے ایاز کو دیکھا۔ اس عمل سے محمود کے دل میں ایاز کی قدر مزید بڑھ گئی۔ ایاز تو ایک غلام تھا جو ہر لمحہ اپنے آقا کی شکر گزاری کے جذبے سے سرشار رہتا تھا۔ افسوس کہ ہم اپنے حقیقی مالک اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بے شمار نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی کڑوی قاش ہمارے منہ میں آتی ہے تو سخت بیزار ہوتے ہیں۔ شکایتوں کے انبار لگا دیتے ہیں۔ جب آسانی میں ہوتے ہیں تو زبان پر شکر نہیں ہوتا، جب ذرا سی مشکل آتی ہے تو زبان پر شکوہ لے آتے ہیں۔ ہمارا رویہ ایاز کی طرح ہونا چاہیے کڑوی قاش پر بھی شکوہ کے بجائے ہمیں اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجیے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں

فی امان اللہ (ایڈیٹر)

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر خاص	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبد السلام	ظہیر سلام	نذیر انبالوی	سید مقبول حسین شاہ	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے۔
ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور
UAN: 042 - 111 62 62 62 Fax: 042 - 6278816
Email: tot.tarbiatfs@gmail.com
tot.tarbiatfs@live.com

CamScanner



حمد

یا اللہ! یا رحمان ہم پہ کرم فرما ہر آن
ہم کو سیدھی راہ دکھا تاک میں ہے ہر دم شیطان
اپنی پناہ میں رکھ ہم کو ہر مشکل فرما آسان
خلق ہمارا اچھا ہو پورے ہوں عہدوپیان
مکہ اور مدینہ جائیں پیدا ہوں اس کے سامان
تیرے فضل و کرم سے ہم بن جائیں اچھے انسان

حمد کا شاعر ہے عابدؔ
یہی ہے اس کی ۔ پہچان

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی، لاہور



وضو خالی منہ ہاتھ دھونے کا نام نہیں۔ وضو کا لفظ ضُو سے ہے جس کا مطلب ہے روشنی، چمک یا نور۔ وضو ایسا عمل ہے جس سے جسم کے وہ حصے جو کھلے رہتے ہیں اور جن پر گردوغبار پڑتا ہے وہ پاک صاف ہو جاتے ہیں اور اِس کے علاوہ وضو سے دل کی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، دل شرک سے پاک ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نور سے منور، تابندہ اور روشن ہوتا ہے۔ دراصل نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ جیسی عظیم ہستی کے دربار میں حاضر ہوتے وقت جسم اور دل دونوں کی پاکیزگی ضروری ہے۔ اس کے بغیر وضو کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

دل کی پاکیزگی یہ ہے کہ دل بُرے خیالات اور شرک سے پاک ہو۔ یہ کامل ایمان ہو کہ ہمارا رَب، ہمارا پروردگار یعنی ہمیں پالنے والا اللہ ہے اور ہمیں جو کچھ بھی ملنا ہے اُسی پاک ذات سے ملنا ہے۔ دینے والا اللہ ہے، باقی سب ذرائع ہیں جن کا پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے۔ ہمارا دل اللہ کی محبت سے منور اور روشن ہو۔ ہمارے دل میں خوشی ہو کہ وہ انتہائی قیمتی لمحات آ گئے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے دربار میں جانے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ وضو کے بارے میں قرآن مجید میں ہے:

سورۂ مائدہ آیت ۶: ”اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے اُٹھو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھو لیا کرو)۔“

صحیح حدیث میں ہے: حضرت عبد اللہ بن زیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ سب سے پہلے دونوں ہاتھ تین بار دھوتے، پھر تین بار کُلی کرتے اور تین بار ناک میں پانی چڑھا کر ناک صاف کرتے۔ تین بار چہرے کو دھوتے، تین تین بار اپنے دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوتے، سر کا مسح اِس طرح کرتے کہ پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو سر کے اگلے حصے سے سر کے پیچھے کی طرف لے جاتے اور پیچھے سے سامنے کی طرف لاتے۔ یہ عمل ایک مرتبہ کرتے۔ پھر آپ اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوتے۔ دایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں پہلے دھوتے۔

(صحیح بخاری کتاب ۴ باب ۳: صحیح مسلم کتاب الطاہرہ باب ۷)

اِس کے علاوہ احادیث کی رو سے سر کا مسح کرنے کے بعد دونوں کانوں کا اور گردن کا مسح کرتے۔ یعنی گیلے ہاتھوں سے چھوٹی انگلی کانوں کے اندر پھیرتے ہیں اور انگوٹھا کانوں کے پیچھے پھیرتے ہیں اور ہاتھوں کی پشت سے گردن کا مسح کرتے ہیں۔ اِس طرح کانوں اور گردن پر پڑی گرد صاف ہو جاتی ہے۔ اَب تک جو سائنسی تحقیق ہوئی ہے اُس سے پتا چلا ہے کہ کانوں کے پیچھے کچھ نسیں ایسی ہوتی ہیں جو دماغ کے اندر جاتی ہیں۔ جب ہم کانوں کے پیچھے مسح کرتے ہیں تو اُن نسوں کے ذریعے دماغ چاق وچوبند ہو جاتا ہے اور ہم دماغی کام بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ دُوسرے پاؤں دھونے سے انسان کی بینائی ٹھیک رہتی ہے۔

صحیح حدیث میں ہے، رسول کریمؐ نے فرمایا کہ قیامت کے روز جب میرے اُمتیوں کو طلب کیا جائے گا تو اُن کے چہرے، ہاتھ اور پاؤں وضو کی وجہ سے چمک رہے ہوں گے۔ اس لئے تم اپنی اس چمک (اور ضُو فشانی) کو صحیح وضو کے ذریعے سے بڑھاؤ۔

(صحیح بخاری کتاب ۴ باب ۳: صحیح مسلم کتاب الطہارہ باب ۱۲)

پیارے بچو! آپ نے دیکھا کہ وضو کے کس قدر فوائد ہیں۔ وضو اگر صحیح طریقہ سے کیا جائے تو ہمارا جسم اور دل دونوں پاک ہوتے ہیں، سستی دُور ہوتی اور جسم میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ بینائی ٹھیک رہتی ہے اور دماغی کام کرنے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم وضو ہمیشہ صحیح طریقے سے اور بڑے شوق سے کریں اور اپنے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے منور کریں۔ آمین۔

موسمِ بہار

ہر شجر پہ یہاں برگ و بار آگیا
بے حساب آ گیا بے شمار آگیا

مرغزاروں میں کلیاں چٹکنے لگیں
رنگِ شاخِ چمن پہ نکھار آگیا

پھر سے باغوں میں بلبل چہکنے لگے
اک نشہ چھا گیا اِک خمار آگیا

جس طرف دیکھیے پھول ہی پھول ہیں
اور پھولوں پہ اِس دل کو پیار آگیا

خوشبوؤں سے معطر ہوئی سرزمیں
دیکھو دیکھو کہ موسمِ بہار آگیا

خوش رہو دوستو ، خوش رہو ساتھیو
لب پہ حرفِ دُعا بار بار آگیا

کرامت بخاری
لاہور

شجر: درخت
برگ: پتے
بار: پھل
مرغزار: سبزے والی جگہ
چمن: باغ
معطر: خوش بودار



دادی اماں زندہ ہیں

حسن ذکی کاظمی (لاہور)

شمسہ نے بال بنانے کے لئے ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھایا اور آئینے میں دیکھنے لگی۔ آئینہ دیکھتے ہوئے وہ ایک دم چونکی۔

"ہائے میرے اللہ! یہ کیا؟" اس کے سر میں سفید بال چمک رہے تھے۔ ایک...... دو...... تین شمسہ نے اپنے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اسے لگا جیسے وہ بوڑھی ہو رہی ہے۔ ٹھوڑی کے نیچے کی کھال کچھ ڈھیلی ڈھیلی نظر آ رہی تھی اور آنکھوں کے نیچے اسے باریک سی جھریاں بھی نظر آئیں۔ اس نے آئینے میں اپنی شکل کو اور غور سے دیکھا۔ آہستہ آہستہ اسے یوں لگا جیسے آئینے میں وہ خود نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے۔ سفید بال، چہرے پر جھریاں۔ شمسہ نے اور غور سے دیکھا تو وہ چیخ پڑی

"ارے دادی اماں آپ!"

پھر اسے محسوس ہوا کہ آئینے میں سے دادی کی آواز آ رہی ہے۔ وہی دُعائیں جو وہ کبھی اسے دیا کرتی تھیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

"اللہ تمہیں لمبی عمر دے، نانی دادی بنو، میری عمر بھی تمہیں لگ جائے۔"

دادی کا عکس آئینے سے غائب ہو گیا اور اُسے پھر اپنی شکل نظر آنے لگی لیکن دادی کی دُعائیں اُس کے دماغ میں اب بھی گونج رہی تھیں۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔

"لو جی! دادی اماں کی دُعائیں اپنا اثر دکھانے لگیں۔ شمسہ بیگم بڑھاپا آن پہنچا۔ بالوں کی چاندی، یہ باریک باریک جھریاں، یہ لٹکتی کھال۔ اب بڑھاپے سے کیسے بچو گی؟"

شمسہ کے منہ سے بے اختیار وہی جملہ نکلا جو وہ دادی سے ان کی دُعاؤں کے جواب میں کہتی تھی۔

"نہیں، نہیں دادی اماں میں ہرگز بوڑھی ہونا نہیں چاہتی۔" اور پھر دادی کی ہنسی کان میں گونجی۔ "ہاہاہا بڑھاپے سے نہ بچ سکو گی میری بنو، بڑھاپے کو کس نے روکا ہے؟ بالکل میری طرح ہو جاؤ گی۔"

دادی کا یہ جملہ کان میں گونجا تو دادی کی تصویر پھر ذہن میں ابھر آئی۔ بڑھاپے میں بھی وہ کتنی اچھی لگتی تھیں۔ معصوم سا چہرہ، ہنس مکھ اور ایسی شخصیت کہ ایک نظر دیکھو تو بار بار دیکھنے کو دل چاہے۔ اُس نے سوچا کہ اگر دادی کی یہ بات پوری ہو جائے کہ میں بڑھاپے میں بالکل ان کی طرح لگوں گی تو پھر میں بوڑھی ہونے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے بڑھاپے کا کوئی ڈر نہیں۔

دادی اماں کی تصویر تو شمسہ کے دماغ میں اُبھری ہی تھی۔ اَب ایک ایک کر کے ان کی ساری باتیں اسے یاد آنا شروع ہو گئیں۔ پاس پڑوس اور خاندان کی ساری عورتیں یہی کہتی تھیں کہ دادی اماں کے چہرے پر جو معصومیت، جو دل کشی اور جو سکون تھا اس کی وجہ وہ نیک اور اچھے اچھے کام تھے جو وہ زندگی بھر کرتی رہی تھیں۔ خاندان اور محلے والوں کی زبان پر

ایک دو نہیں بہت سے قصے تھے۔ دادی اماں کافی عرصہ پہلے دُنیا سے چلی گئیں تھیں، لیکن ان کی باتیں ابھی تک زندہ ہیں۔

ابھی کچھ دن پہلے کلثوم آنٹی انہیں یاد کر رہی تھیں، جو سامنے والی بلڈنگ میں رہتی ہیں۔ وہ بتا رہی تھیں۔

"جب میری اماں کا انتقال ہوا تو ان کے چالیسویں تک تمہاری دادی اماں روزانہ شام کو ہمارے گھر آتی تھیں اور دیر تک مجھ سے اور میری بہنوں سے باتیں کرتی رہتیں۔ ہمیں تسلی دیتیں، سمجھاتیں رہتیں، گھر کے کاموں میں مشورہ اور مدد دیتیں۔ وہ روز آنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کی باتوں سے ہم بہنوں کو بڑا سکون ملا اور ہمیں اماں کا غم بھلانے میں بڑی مدد ملی۔"

آمنہ خالہ جو گلی کے آخر میں رہتی ہیں، جب بھی دادی اماں کو یاد کرتی ہیں یہ ضرور کہتی ہیں۔

"تمہاری دادی نے تو ہمیں کبھی ساس کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ جب میں بیاہ کر آئی تو ساس کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ اللہ بخشے تمہاری دادی اماں نے مجھے گھرداری سکھائی، زمانے کی اونچ نیچ بتائی۔ ایسی محبت دی کہ بس کیا بتاؤں۔ ہائے ہائے اب ایسے نیک لوگ کہاں ہیں اس دُنیا میں۔"

صندل پکوڑے والی کو ابھی تک یہ بات یاد ہے کہ جس دن اس کے پکوڑے نہ بکتے تو دادی پکوڑے اس سے خرید کر محلے کے بچوں میں بانٹ دیتیں تاکہ اس کا نقصان نہ ہو۔ خاص طور سے رمضان میں تو صندل کو ان کا بڑا سہارا رہتا تھا۔

حمیدہ کو دادی کی یہ بات یاد رہی تھی کہ اس کی بیٹی کو نمونیا ہوا تو دادی اماں اس کے لئے رحمت بن گئیں۔ پیسے سے تو اس غریب کی مدد کی ہی، لیکن ویسے بھی بڑی ہمدردی کی۔ کئی دن حمیدہ اور اس کی بچی کو اپنے کمرے میں سلایا تاکہ وہ ٹھنڈ سے بچی رہے۔ اکثر رات کو وہ جاگتیں اور بچی کے پاس بیٹھ جاتیں۔ وہ حمیدہ سے کہتیں۔

"تم سو جاؤ، بہت جاگی ہو، تھوڑا آرام کر لو، میں جاگ رہی ہوں۔ بچی کی تم فکر نہ کرو۔"

حمیدہ واقعی ایسی بے فکر ہو کر سوتی کہ گھنٹوں سوتی رہتی۔

لیکن دادی اماں اسے ہرگز نہ جگاتیں۔

محسن بھائی بتاتے ہیں کہ جب وہ چھوٹے تھے تو دادی اماں انہیں کتابوں کے لئے ہر مہینے پیسے دیتی تھیں۔ وہ خود تو زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں لیکن ان کی خواہش یہ تھی کہ قوم کا ہر بچہ خوب پڑھے لکھے، ترقی کرے، اچھے اخلاق اور مضبوط کردار کا مالک بنے۔ محسن بھائی کو یاد ہے کہ جب دادی اماں انہیں کتابوں کے لئے پیسے دیتی تھیں تو یہ ضرور کہتی تھیں۔

"دیکھ محسن بیٹے! مجھے یقین ہے کہ تو ان پیسوں سے اچھی اچھی کتابیں خریدے گا، لیکن میرے پیارے بیٹے ان کتابوں کو اپنے تک ہی نہ رکھنا۔ محلے کے سارے بچوں کو پڑھوانا۔ بیٹا علم کو خوب پھیلاؤ، تمہیں اس کا اجر ملے گا اور ہاں میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ کسی بھی بچے کے پاس قلم، پنسل، کاپی یا کتابوں کے لئے پیسے نہ ہوں تو مجھے بتا دینا۔ اور اگر فیس کی کوئی بات ہو تو بھی بتا دینا۔"

ایسے کتنے ہی واقعے ہیں، لیکن ایک واقعہ ایسا ہے جو بہت اہم ہے۔ ایسا واقعہ جس سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچا اور اس کا اثر بہت دُور تک ہوا۔ شمسہ نے سنا تھا کہ دادی اماں کے محلے میں پانچ سات گھر چھوڑ کر نسرین نام کی ایک خاتون رہتی تھیں۔ بڑی اچھی، بڑی نیک، ان کا چھوٹا سا گھر تھا۔ شوہر کی تنخواہ تھوڑی تھی۔ گھر کا خرچ مشکل سے چلتا تھا، لیکن اس خاتون کو یہ دُھن تھی کہ بچوں کو اچھی تعلیم دلوائیں۔ ان کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی اور پھر دو بیٹے۔ بھلا تین بچوں کو تعلیم دلوانا کوئی آسان کام تھا اور وہ بھی اچھی تعلیم، لیکن یہ خاتون تھیں دھن کی پکی۔ چٹنی روٹی کھاتیں لیکن کسی نہ کسی طرح بچوں کی تعلیم کے لئے کچھ رقم بچا لیتیں۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی بیٹی پروین بہت ذہین اور پڑھائی کی شوقین نکلی۔ اس نے میٹرک میں بہت اچھے نمبر لئے اور انٹر میں اور بھی اچھے نمبروں سے پاس ہوئی اور خوش قسمتی سے اسے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ یوں کچھ وظیفہ ملا اور کچھ انشورنس کی رقم کام آئی۔ پروین ڈاکٹری کی منزل کی طرف چل پڑی۔

ایک سال گزرا، دُوسرا سال گزرا۔ لیکن ابھی تو تین سال باقی تھے۔ کام بڑا کٹھن تھا۔ یہ خاتون رات سونے کے لئے بستر پر لیٹتیں تو ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ان کے ذہن میں اُبھر آتا۔

"یہ تین سال کسے کیسے کٹیں گے؟ جتنی شوہر کی آمدنی بڑھتی ہے، اس سے کہیں زیادہ زیادہ مہنگائی بڑھ جاتی ہے۔ انشورنس کے پیسے بھی ختم ہو رہے ہیں، ہو گا کیا؟"

پھر وہ کروٹ لیتیں اور دل ہی دل میں کہتیں: "نسرین! دل چھوٹا نہ کر۔ وہ جو نیلی چھتری والا ہے اس کے نزدیک کوئی کام



مشکل نہیں۔ بس اس کے تو اشارے پر تقدیریں بنتی اور سنورتی ہیں۔ وہ چاہے تو پلک جھپکنے میں انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دے۔"

بس یہ خیال آتے ہی انہیں اپنی بیٹی کا مستقبل روشن نظر آنے لگتا اور یوں لگتا جیسے رستے کی ہر رُکاوٹ ہٹتی جا رہی ہے۔ لیکن حالات نے اچانک ایسا پلٹا کھایا کہ نسرین کے لئے بیٹی کی تعلیم جاری رکھنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔

ہوا یوں کہ پروین کے والد کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اس سے بچ تو گئے، لیکن وہ اس قابل نہ رہے کہ ملازمت جاری رکھ سکتے۔ انہیں پنشن لینا پڑی اور آمدنی بہت ہی کم رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ اور وسیلے پیدا کئے، لیکن پھر بھی یہ ممکن نہ تھا کہ گھر کا خرچ بھی پورا ہو اور بچوں کی تعلیم بھی۔ ایک دن دادی اماں جو اس وقت دادی اماں نہیں بنی تھیں بلکہ دو نوجوان بچوں کی ماں تھیں نسرین کے گھر ان کے شوہر کی خیریت پوچھنے گئیں۔ جس دن سے نسرین کے شوہر مبارک احمد بیمار ہوئے تھے۔ دادی اماں نے جن کا نام بلقیس بانو تھا، یہ طریقہ بنا لیا تھا کہ وہ ہر تیسرے چوتھے دن ان کے گھر خیریت معلوم کرنے جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھتیں، نسرین کو تسلی دیتیں اور بچوں کا حوصلہ بڑھاتیں۔ چلتے وقت بلقیس بانو یہ ضرور کہتی تھیں۔ "دیکھو نسرین! تم میری چھوٹی بہن کی طرح ہو۔ کبھی بھی کوئی مسئلہ ہو یا کوئی کام ہو تو تکلف نہ کرنا۔ میں کوئی خدمت کر سکی تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔"

نسرین ایسی غیرت دار خاتون تھیں کہ انہوں نے بڑی بڑی تکلیفیں جھیلیں، لیکن کسی سے مدد نہ مانگی۔ ایک دن جو بلقیس بانو نسرین کے گھر گئیں تو باتوں باتوں میں نسرین کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ وہ اب پروین تعلیم جاری نہ رکھ سکے گی۔

بلقیس بانو تو حیران رہ گئیں۔

"ہائیں نسرین! تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔"

نسرین اپنی مجبوری بیان کرتی رہیں اور بلقیس بانو انہیں

سمجھاتی رہیں اور چلتے وقت انہوں نے کہا: "اچھا جلدی نہ کرو۔ تھوڑا سا اور سوچ لو۔ میں دو تین بعد پھر چکر لگاؤں گی۔"

تین دن بعد بلقیس بانو نسرین کے گھر گئیں تو ایک فیصلہ کر کے گئیں۔ دونوں میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور آخر بلقیس بانو نسرین سے یہ بات منوانے پر راضی ہو گئیں کہ پروین تعلیم جاری رہے گی۔ طے یہ پایا کہ پروین کی تعلیم کے آخری تین سال کا سارا خرچ بلقیس بانو اسے قرض کے طور پر دیں گی اور جب پروین پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جائے گی تو وہ تھوڑا تھوڑا کر کے یہ قرض اُتار دے گی۔

تین سال آنکھ جھپکنے میں گزر گئے اور پروین ایم بی بی ایس کے امتحان میں شان دار کام یابی حاصل کر کے ڈاکٹر بن گئی۔ ایک دو مہینے بعد اسے ایک ہسپتال میں ملازمت بھی مل گئی۔ ملازمت ملتے ہی نسرین بلقیس بانو کے پاس مٹھائی لے کر آئیں اور آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کرتی رہیں۔ بلقیس بانو کو اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ پروین کو اتنی جلدی اتنی اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ وہ کہنے لگیں: "نسرین! آج کا دن بڑا مبارک دن ہے۔ آج مجھے دوہری خوشی ملی ہے۔ ایک تو پروین کی ملازمت کی اور دُوسری ارشد میاں کی ترقی کی۔"

نسرین خوش ہو کر بولی۔ "ارے واہ! بلقیس آپا یہ تو زبردست خبر ہے، بہت بہت مبارک ہو آپ کو، تو اب ارشد میاں ماشاء اللہ......"

بلقیس بانو نے جملہ پورا کیا "وائس پریزیڈنٹ ہو گئے ہیں اپنے بنک میں۔ بڑی جلدی ترقی ملی ماشاء اللہ۔"

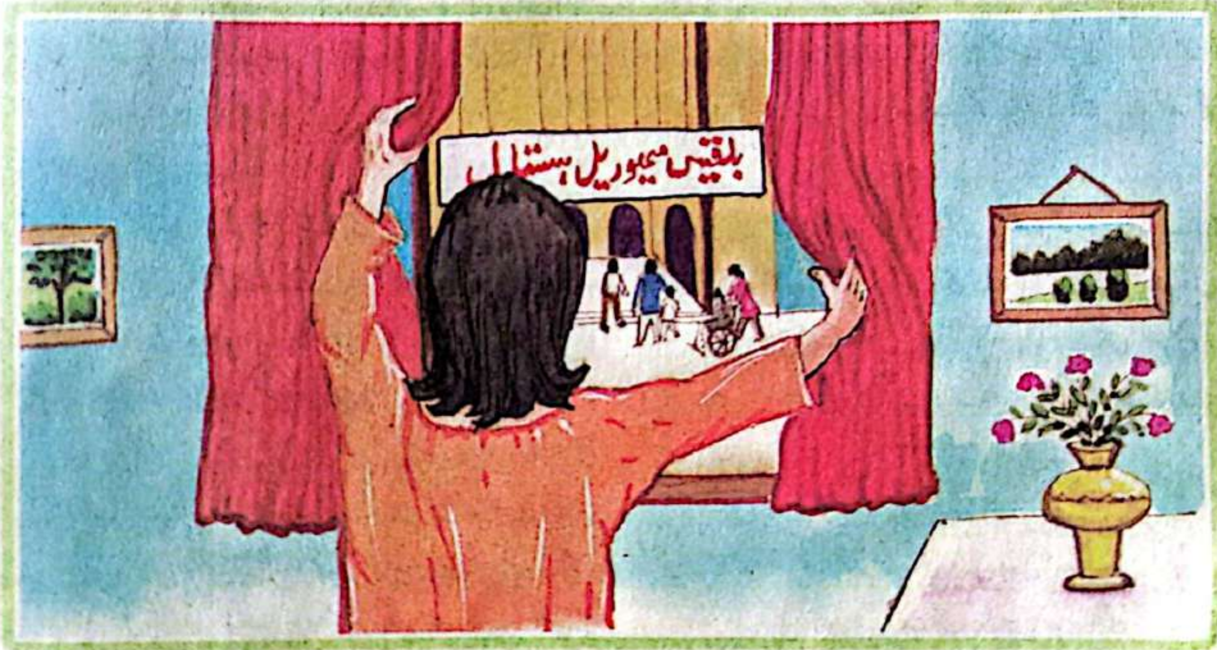
نسرین نے تعریف کی: "دراصل ارشد میاں ہیں بھی بہت محنتی اور ذہین۔"

پھر اور باتیں ہونے لگیں اور موقعہ پاتے ہی نسرین نے کہا "بلقیس آپا! آپ نے میری بے حد مدد کی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ وقت آگیا کہ پروین اپنے قرض کی ادائیگی شروع کر دے گی۔"

بلقیس بانو سن کر بولیں۔ "ارے ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی اس نے کام شروع نہیں کیا اور تمھیں قرض اتارنے کی فکر ہو گئی۔ ابھی چپکی بیٹھی رہو۔ میں چند دن بعد تمہارے پاس آؤں گی تو بات کروں گی۔"

چند دنوں بعد بلقیس آپا مٹھائی کی ٹوکری اور تحفے تحائف سے لدی پھندی نسرین کے گھر پہنچیں اور بیٹھتے ہی انہوں نے کہا۔

"لو بھئی نسرین! میں نے تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں نے پروین کا قرض معاف کیا۔ میں ایک پائی بھی واپس نہیں لوں گی، لیکن قرض کے بدلے میں خود پروین کو اپنے گھر لے جاؤں



گی۔ اور اب وہ وہاں میری بیٹی بن کے رہے گی۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے؟"

نسرین کچھ حیران ہو کر بولیں: "بلقیس آپا! میں آپ کی بات سمجھ نہیں پائی۔"

بلقیس بانو زور سے ہنسیں اور کہنے لگیں: "ارے بھولی ذرا سوچو تو کہ ارشد اور پروین کی جوڑی کیسی شان دار رہے گی۔اللہ رکھے دونوں پڑھے لکھے، خوب صورت، ہنس مکھ اور تمیز دار ہیں۔"

نسرین نے جلدی سے بات کاٹی: "نہیں، بلقیس آپا نہیں۔ یہ جوڑ نہیں بنتا۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانا مناسب نہیں۔ ہمارا یہ چھوٹا سا کچا پکا گھر، ہم نے دال روٹی کھا کر زندگی گزاری ہے۔ مشکل سے سفید پوشی قائم رکھی۔ پروین بھلا اس گھروندے سے نکل کر حویلی میں جاتی ہوئی کیا اچھی لگے گی اور وہاں نباہ کیسے کرے گی؟ آپ کی محبت کا بے حد شکریہ، لیکن یہ رشتہ نہیں ہو سکے گا۔"

بلقیس بانو تو یہ طے کر کے آئی تھیں کہ پروین کو بہو بنا کر رہیں گی۔ وہ بولیں:

"نسرین! میں نہ سننے تو نہیں آئی۔ میری بہن بات یہ ہے کہ میں نے، ارشد نے اور اس کے ابو نے ہر بات پر غور کر لیا ہے اور ہماری دلی خواہش ہے کہ پروین ہماری بہو بنے۔ تم بھی ارشد کو اچھی طرح جانتی ہو اور تمہارے شوہر اور بیٹوں کو بھی اس کے بارے میں پتہ ہے، پیسے اور اونچ نیچ کی کوئی حقیقت نہیں۔ بے شک تمہارے پاس پیسہ نہیں، لیکن شرافت، غیرت اور خودداری کی دولت تو ہے۔ تم نے اس پریشانی میں جتنی غیرت سے اپنا وقت گزارا ہے اس کی ہم سب کے دل میں بڑی قدر ہے۔"

آخر نسرین کو بلقیس بانو کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے اور چند مہینے ہی گزرے تھے کہ پروین بہو بن کر ان کے گھر آگئی۔ شادی کو کچھ دن ہی گزرے تھے کہ ایک دن بلقیس بانو نے بہو کو بڑے پیار سے پاس بٹھا کر بات شروع کی۔

"دیکھو بیٹی! اللہ نے تمہیں اس قابل کیا کہ تم نے تعلیم پوری کی، تمہیں اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔ میں نے کچھ رقم علیحدہ کی ہوئی ہے اور میری خواہش ہے کہ اس سے ایک چھوٹا سا کلینک اپنے محلے میں بنوا دوں، جہاں شام کو تم تھوڑا سا وقت نکال کر مریضوں کو دیکھ لیا کرو اور مفت دوا دیا کرو۔ اللہ تمہیں اس کا جزا دے گا۔"

بہو فوراً اس خدمت کے لیے تیار ہو گئی اور کچھ ہی دنوں میں کلینک کی عمارت کھڑی ہو گئی اور ضروری سامان بھی خرید لیا گیا۔ پروین دن میں ہسپتال میں کام کرتیں اور شام کو کچھ وقت کلینک کے لیے نکالتیں۔

چند سال یہ کلینک اسی طرح چلتا رہا اور پھر بلقیس بانو کے پیسے، پروین کی محنت اور کچھ نیک لوگوں کے تعاون سے اس کو وسعت دی گئی جس سے کلینک نے ایک چھوٹے سے ہسپتال کی شکل اختیار کر لی۔

شمسہ اچانک اپنے خیالوں کی دُنیا سے نکلی اور کھڑے ہو کر اُس نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ سڑک کے آخر میں ایک عمارت کھڑی تھی۔ اُس کے گیٹ پر لکھا تھا "بلقیس میموریل ہسپتال"۔ شمسہ نے پھر سوچنا شروع کیا: "یہ میری دادی اماں بلقیس بانو کی یادگار ہے۔ اِس کی تعمیر میں دادی کا خلوص، میری ماں ڈاکٹر پروین اور والد ارشد خان کا جذبہ اور نیک لوگوں کا تعاون شامل ہے۔ کون کہتا ہے دادی اماں دُنیا سے چلی گئیں ہیں۔ جب تک یہ ہسپتال دُکھی انسانیت کی خدمت کے لئے موجود ہے دادی اماں زندہ ہیں۔"

شمسہ نے کھڑکی سے ہٹ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھا۔ دادی اماں کا چہرہ وہاں مسکرا رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے دادی کے ہونٹ ہلے اور شمسہ کے کان میں آواز آئی۔ "میرے اللہ میری پوتی کو میرے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کر۔"

شمسہ نے آہستہ سے کہا: "آمین" اور پھر وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

---☆☆---

میرے پسندیدہ اشعار

آپ کے پسندیدہ اشعار پر مبنی "تعلیم وتربیت" کا نیا دل چسپ سلسلہ

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے
(نوید حسین، لاہور)

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی بُرہان!
(محمد اسد، میاں والی)

تو نے الفاظ کی تاثیر کو پرکھا ہی نہیں
نرم لہجے سے تو پتھر بھی پگھل جاتے ہیں
(حاشر احمد، کراچی)

مشکل اس دور میں اظہارِ مسرت ہے ولی
لوگ ہنستے ہیں تو رونے کا گماں ہوتا ہے
(تاج محمد، ڈیرہ غازی خان)

ہم خود تراشتے ہیں منازل کے سنگِ راہ
ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا
(عامر خان، جھنگ)

جس کو طوفاں سے الجھنے کی ہو عادت محسنؔ
اُس کشتی کو سمندر بھی دُعا دیتا ہے
(حفصہ طیبہ، میاں چنوں)

زرد پتوں کو نہ پاؤں سے کچل کر گزرو
مٹنے والے یہ ہمیں پیغامِ فنا دیتے ہیں
(انس احمد ضیاء، بھلوال)

زندہ رہنے کا سلیقہ کوئی ہم سے سیکھے
خار زاروں میں بھی رہنا تو مہکتے رہنا
(اقراء کائنات، کراچی)

منزلیں بڑھ کے قدم ان کے چوم لیا کرتی ہیں
باندھ رکھتے ہیں جو پاؤں سے ارادہ اپنا
(حسن رضا سردار، کامونکی)

شام کی دہلیز پر سورج کا ماتم کس لیے
صبح ہونے تک اندھیرا خود فنا ہو جائے گا
(محمد ضیاء اللہ، میاں والی)

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!
(سارہ جاوید چوہدری، وہاڑی)

تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
(محمد حسن سرفراز، راول پنڈی)

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
(زید احمد، لاہور)

وہ انسان نہیں جو ڈر جائے حالات کے خونی منظر سے
جس دور میں جینا مشکل ہو اُس دور میں جینا لازم ہے
(اقصیٰ اصغر، بہاول پور)

غیر کی جدوجہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پہ ناز کر، اعتماد کر
(شہیر ثاقب، راول پنڈی)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح قلم تیرے ہیں
(میمونہ مقدس، ساہی والی)

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے
(ذیشان احمد، کراچی)

جنگل میں اس طرح کی اداسی نہ تھی کبھی
اے کارواں ٹھہر جا کوئی ساتھی بچھڑ گیا
(احمد سلمان، گکھڑ منڈی)

جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھی دھڑکنیں
ان کو زبان ملی تو ہم پر ہی برس پڑے
(فرخندہ عالم، لاہور)

ہر چند راہ میں کانٹے تھے بچھے ہوئے
جس کو تیری طلب تھی گزرتا چلا گیا
(سید احمد حسن، فیصل آباد)

ہجومِ غم میری فطرت بدل نہیں سکتا
میں کیا کروں میری عادت ہے مسکرانے کی
(محمد ریحان صفدر، ڈیرہ غازی خان)

خبر لو اپنے وقت کی خبر لو
اڑا جاتا ہے، جو کرنا ہے کر لو
(گلاب نیاز خان، کوہاٹ)

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
(محمد ضیاء الاسلام، ملتان)

بازارِ زمانہ سے کچھ بھی نہ ہم خریدیں گے
ہاں بیچ کر خوشی اپنی اوروں کے غم خریدیں گے
(سید منظر بلال، سمندری)

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
(ملک ہاشم ضیاء، گجرات)

سورج ہمیں ہر شام یہ درس دیتا ہے
کہ مغرب کی طرف جاؤ گے تو ڈوب جاؤ گے
(کائنات فاطمہ، گجرات)

CamScanner



ایک پہاڑ اور گلہری

علامہ اقبال

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اِک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

ذرا سی چیز ہے ، اس پر غرور ! کیا کہنا !
یہ عقل اور یہ سمجھ ، یہ شعور ! کیا کہنا !

خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں !
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں !

تیری بساط ہے کیا میری شان کے آگے ؟
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں ، جانور غریب کہاں !

کہا یہ سُن کے گلہری نے ، منہ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انھیں نکال ذرا !

جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا !
نہیں ہے تُو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا

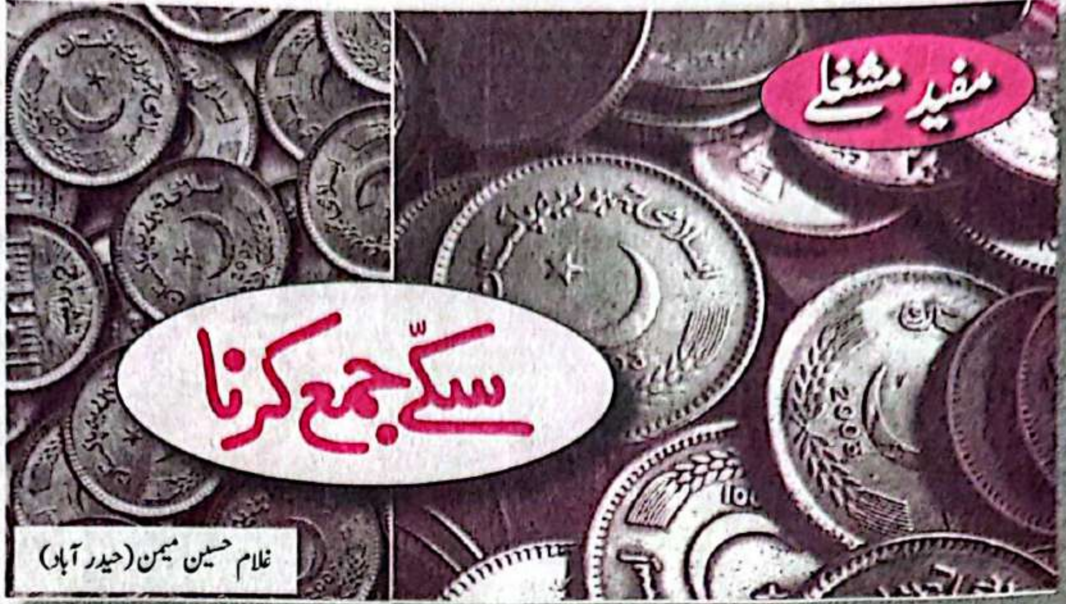
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا ، کوئی چھوٹا ، یہ اُس کی حکمت ہے

بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اُس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اُس نے

قدم اُٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے ! خوبی ہے اور کیا تجھ میں

جو تُو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں



سکّے جمع کرنا

غلام حسین میمن (حیدر آباد)

ڈاک ٹکٹ کے بعد جو مشغلہ سب سے زیادہ مقبول ہے وہ ہے سکے جمع کرنا ہے۔ اس مشغلے سے ہم کئی علوم میں اضافہ کر سکتے ہیں جن میں تاریخ، جغرافیہ، فنونِ لطیفہ اور مذاہب وغیرہ۔ سکوں پر جو مختلف تحریریں کندہ ہوتی ہیں وہ بھی معلومات میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔

معلوم تاریخ کے مطابق پہلی بار اس مشغلے کا آغاز رومی سلطنت سے ہوا۔ اب یہ مشغلہ عالم گیر شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کے شائقین میں انگلستان کے بادشاہ چارلس اول، فرانس کے بادشاہ لوئی چہار دہم، مصر کے بادشاہ شاہ فاروق اور اٹلی کے بادشاہ وکٹرا یمونیل سوم کا نام بطور خاص لیا جاتا ہے۔

اب ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ سکہ دراصل کیا ہے اور اس کا وجود کیوں کر عمل میں آیا......؟" سکہ دراصل دھات کا وہ ٹکڑا ہوتا ہے جس پر حکومت کی مہر لگی ہوتی ہے اور یہ حکومت کی مقرر کردہ قیمت پر ہی بازار میں چلتا ہے۔ یہ عام طور پر سونے، چاندی نکل، تانبے، پیتل اور ملی جلی دھاتوں سے بنایا جاتا ہے۔ سکے کی موجودہ شکل سے پہلے تجارتی لین دین کے لیے "بارٹرسسٹم" (Barter system) موجود تھا۔ اس سسٹم میں مال کے بدلے مال ملتا تھا۔ یعنی زائد مال کے بدلے لوگ اپنی ضرورت کی کوئی دُوسری شے خرید لیتے تھے۔

سکوں کے رواج کا شرف اہل لیدیا (Lydians) کو حاصل ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تقریباً چھ /سات سو سال قبل اناطولیہ کی قدیم بادشاہت تھی۔ یہ پہلی مغربی قوم تھی جس نے معیاری سکے استعمال کیے۔ یوں آہستہ آہستہ مختلف دھاتوں کے سکوں کا رواج بڑھنے لگا۔

اہل لیدیا سے یہ رواج یونان اور یورپ پہنچا۔ امریکا میں پہلی ٹکسال (وہ جگہ جہاں سکے ڈھالے/بنائے جاتے ہیں) 1773ء میں قائم کی گئی۔ پاکستان میں سکے ڈھالنے کی ٹکسال لاہور میں ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں عبدالملک بن مروان۔ (پیدائش: 646ء وفات: 715ء) پہلا بادشاہ تھا جس نے ایک مرکزی ٹکسال قائم کی۔ جہاں سونے کے دینار اور چاندی کے درہم ڈھلنے شروع ہوئے۔ برصغیر میں سلطان محمد تغلق (دورِ حکومت 1325ء تا 1351ء) نے تانبے کے سکے جاری کیے، لیکن بہت زیادہ جعلی سکے گردش میں آگئے تھے۔

یقیناً اب آپ کے ذہن میں یہ سوال آرہا ہو گا کہ سکے جمع کیسے کریں۔ اس وقت حکومتِ پاکستان کی جانب سے جاری کردہ ایک روپے، دو روپے اور پانچ روپے مالیت کے سکے مارکیٹ میں گردش کر رہے ہیں۔ ماضی میں ایک پیسے، 2پیسے، پانچ پیسے، دس پیسے، پچیس پیسے اور پچاس پیسے کے سکے بھی چلتے تھے۔

حکومتِ پاکستان نے بعض خاص موقعوں پر سونے اور چاندی کے یادگاری سکے بھی جاری کیے مثلاً 24 دسمبر 1976ء کو بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے سو سالہ یومِ پیدائش کے حوالے سے سونے اور چاندی کے پانچ سو اور ایک سو روپے والے سکے، دُوسری اسلامی سربراہی کانفرنس



جو لاہور میں 1974ء کو ہوئی تھی کے حوالے سے سونے اور چاندی کے سکے جن کی مالیت ایک ہزار اور ایک سو روپے تھی جاری کیے گئے تھے۔ 2003ء محترمہ فاطمہ جناحؒ کا سال قرار پایا تھا۔ اس موقع پر دس روپے مالیت کا خصوصی سکہ جاری ہوا، 27 دسمبر 2008ء کو پاکستان کی سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی پہلی برسی کے موقع پر 10 روپے مالیت کا خصوصی سکہ اور یکم اکتوبر 2009ء کو عوامی جمہوریہ چین کے 60 ویں یومِ آزادی کے موقع پر دس روپے مالیت کا خصوصی سکہ جاری کیا۔ چوں کہ یہ سکے محدود تعداد میں جاری کیے جاتے ہیں اس لیے اب یہ نایاب ہیں اور کئی گنا قیمت پر بھی دستیاب نہیں۔

آپ سکے جمع کرنے کا آغاز ان ہی سکوں سے کریں جو آج کل گردش میں ہیں اور آپ کے پاس موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے دوستوں، بزرگوں اور رشتہ داروں سے بھی اس سلسلے میں مدد لیجیے کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس وہ پرانے سکے موجود ہوں جو اب نایاب ہو چکے ہیں۔ آپ مارکیٹ میں سکوں کی خریدوفروخت کرنے والے کسی ڈیلر سے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ کوئی بیرون ملک جانے والا دوست یا رشتہ دار بھی اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ جب وہ وطن آئے تو آپ کے لیے چند سکے لا سکتا ہے، جو آپ کے سکوں کے خزانے میں اضافے کا باعث بن سکتا ہے۔ بعض ممالک میں سکے جمع کرنے والے شائقین کے لیے سکوں کی مکمل سیریز Proof set بھی جاری کی جاتی ہیں۔

بعض لوگ صرف مخصوص قسم کے سکے جمع کرنا پسند کرتے ہیں مثلاً کسی ایک ملک کے سکے، یا ایسے سکے جن پر کسی بادشاہ کا چہرہ بنا ہو یا کسی جانور کی تصویر کندہ ہو۔ اس قسم کے سکوں کا رواج یورپی ممالک میں عام ہے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ کسی ایک ہی عہد کے پرانے سکے جمع کرنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ سکوں کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے آپ کتب خانوں سے کسی کتابوں کی دُکان سے اس موضوع پر مزید کتب حاصل کر کے اپنی معلومات بڑھا سکتے ہیں تاکہ آپ یہ مشغلہ مزید بہتر انداز سے اپنا سکیں۔

ڈاک کے ٹکٹ اور ماچسوں کے لیبل کے مقابلے میں سکے زیادہ عرصے تک محفوظ رہتے ہیں اور خراب نہیں ہوتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سکے قیمتی ہوتے جاتے ہیں۔ یاد رکھیے سکوں کی قیمت کا تعین اس کی عمر سے نہیں بلکہ اس کی نایابی اور حالت دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ اس لیے سکوں کو کبھی کھلی حالت میں نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اسے بھی ڈاک ٹکٹوں کی طرح محفوظ اور ممکن ہو تو کسی کیٹلاگ میں رکھیے۔ اسے بار بار دھونے اور پاؤڈر کا استعمال سے بھی گریز کیجیے۔

اگر آپ کو ملک میں یا بیرونِ ملک کے کسی عجائب گھر میں جانے کا اتفاق ہو تو وہاں پر موجود سکے بھی آپ کو دل چسپ معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سکوں کی بابت معلومات کے لیے آپ بینک دولت پاکستان (State Bank of Pakistan) سے بھی رجوع کیا جاسکتا ہے۔

☆☆

راز

علی اکمل تصور (قصور)

انسان کی فطرت ہے وہ تنہا نہیں رہ سکتا۔ وہ گھر بناتا ہے، رشتے بناتا ہے۔ کچھ رشتے اُسے وراثت میں ملتے ہیں، کچھ رشتوں کا وہ وارث ہوتا ہے۔ یہ خون کے رشتے ہوتے ہیں۔ کچھ رشتے دل کے ہوتے ہیں۔ ان رشتوں کو دوستی کا نام دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ دوستی دل سے ہوتی ہے۔ انسان کے اردگرد اُس کے جاننے والے، اُس سے واقفیت رکھنے والے بہت سے لوگ ہوتے ہیں، لیکن دوست کوئی ایک ہی ہوتا ہے۔

اشرف کا بھی صرف ایک دوست رضوان تھا۔ رضوان اور اشرف ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔ اُن کی پہلی ملاقات سکول میں ہوئی تھی۔ اُس وقت وہ دونوں پانچ سال کے تھے۔ اور اب اس ملاقات کو پینتالیس سال گزر چکے تھے۔ آج بھی اُن کی دوستی میں ایثار، قربانی اور وفا کے سچے جذبات موجود تھے۔

اشرف کھل بنولہ کا کام کرتا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک بڑی سی دُکان اُس نے کرائے پر لے رکھی تھی۔ اس دُکان میں پانچ سو سے زائد کھل بنولہ کی بوریاں موجود رہتی تھیں۔ دیہاتی اپنی بھینسوں کے دودھ میں اضافہ کے لیے اشرف سے بنولہ کی کھل خریدتے تھے۔ رقم کا حساب مہینہ ختم ہونے پر ہوتا تھا۔ اشرف کی خوش اخلاقی اور ایمان داری کی وجہ سے کام اچھا چل رہا تھا۔ پورا مہینہ مال ادھار لینے اور ادھار دینے میں گزر جاتا تھا۔ اشرف کے پاس ایک موٹا سا رجسٹر موجود تھا۔ کس سے کیا لیا؟ کس کو کیا دیا؟ سارا حساب اشرف اس رجسٹر میں لکھتا رہتا تھا۔ اشرف کے بڑے بیٹے کا نام وحید تھا۔ وہ اب کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ فرصت کے وقت وہ دُکان پر آجاتا تھا اور کام میں اپنے ابو کی مدد کرتا تھا۔ اشرف خوش ہوتا تھا کہ وحید کام کو سمجھ رہا ہے۔ یہی سمجھ تو آنے والے وقت میں اُس کے کام آنے والی تھی۔ چھٹی والے دن وحید اپنا سارا وقت دُکان پر ہی گزارتا تھا۔ وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔ جب رضوان اشرف کی دُکان میں داخل ہوا۔ تمام کام چھوڑ کر اشرف رضوان کی طرف لپکا۔

"میرا دوست آیا......" اشرف رضوان کے گلے لگ گیا تھا، لیکن جوگرم جوشی اشرف کے رویے میں تھی وہ رضوان کے رویے سے ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ رضوان پریشان ہے۔

"سب خیریت تو ہے؟" اشرف نے پوچھا۔ رضوان کے چہرے پر مردہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"خیریت نہیں ہے، اسی لیے تو میں آیا ہوں......" رضوان فوراً مطلب کی بات زبان پر لے آیا تھا۔

"میری جان تم پر قربان...... کیا ہوا ہے؟" اشرف رضوان سے بھی زیادہ فکر مند نظر آنے لگا تھا۔

"اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ مجھے ضرورت ہے...... وہ میں......" اشرف کو اپنی ضرورت بتاتے ہوئے رضوان کی زبان اٹک گئی تھی۔

"ہاں...... ہاں...... کہو...... گھبراؤ مت......" اشرف نے اُسے حوصلہ دیا۔ وحید بھی پاس آگیا تھا۔

"اشرف بھائی! میری رقم ایک جگہ پر پھنسی ہوئی ہے۔ اگلے ماہ کے آخر میں وہ رقم مجھے مل جائے گی۔ میرے کاروبار کے حوالے سے میری مجبوری ہے کہ رقم مجھے ابھی چاہیے۔ میں مدد کی غرض سے آیا ہوں۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟" رضوان کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"کیوں نہیں...... بتاؤ کتنی رقم چاہیے؟" اشرف بولا۔

"مجھے پانچ لاکھ روپے کی ضرورت ہے......" رضوان نے اپنی ضرورت بتا دی۔ اشرف کا سر جھک گیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"فکر مت کرو کام ہو جائے گا۔ اتنی رقم دُکان میں نہیں ہے گھر سے مل جائے گی......" پھر اشرف وحید کی طرف پلٹا۔

"وحید بیٹا! گھر جاؤ......اپنی امی سے کہو کہ پانچ لاکھ روپیہ دے دیں......"

"جی ابو جی!" اتنا کہہ کر وحید دُکان سے باہر نکل گیا۔ وہ سن رہا تھا اس کے ابو رضوان سے کہہ رہے تھے۔

"رضوان بھائی! اطمینان سے بیٹھو۔ وحید ابھی آدھے گھنٹے میں آجائے گا......"

وحید نے دُکان میں تو اپنے جذبات پر قابو رکھا تھا، لیکن اب اُس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اُس کے دماغ میں ایک ہلچل تھی۔

"بھلا یہ کیا بات ہوئی کوئی بھی آکر اتنی بڑی رقم کا مطالبہ کرے اور اُسے جواب نہ دیا جائے۔ بلکہ کہا جائے کہ گھر سے لادو۔ ہم نے کوئی بینک کھول رکھا ہے...... دوستی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جسے دیکھو دوستی کے نام پر ہاتھ پھیلانے چلا آتا ہے۔" وحید کی سوچ بہت زہریلی ہو چکی تھی۔ خود سے باتیں کرتا وہ گھر پہنچ گیا۔

اس نے اپنی امی کو ساری بات بتائی اور ابو کا پیغام دیا کہ پانچ لاکھ روپیہ دے دیجئے۔ امی تو گھبرا گئیں۔

"بیٹا! رقم تو میرے پاس موجود تھی، لیکن وہ تو رقم تمہارے ابو پچھلے ہفتے لے گئے تھے۔ انہوں نے یہ رقم فیکٹری میں جمع کرادی تھی تاکہ نیا مال مل سکے......"

یہ بات سن کر وحید خوش ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اپنے دوست کو ٹالنے کے لیے ابو نے بہانہ بنایا تھا۔ یہ اچھا ہے۔ وحید واپس لوٹ آیا۔ دُکان پر ابو اُس کے منتظر تھے۔ رضوان کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کی طرف سے انکار سن کر ابو کا بھی سر جھک گیا۔

"رضوان بھائی! تم فکر مت کرنا میں بہت جلد روپوں کا انتظام کر دوں گا......"

اشرف نے رضوان سے یہ آخری بات کہی تھی۔ پھر رضوان سر جھکائے دُکان سے باہر نکل گیا۔ اُس کے جاتے ہی وحید ہنستے ہوئے بولا۔

"ابو! آپ نے بہت اچھا کیا جو اپنے دوست کو ٹال دیا۔ دوستوں کو تقاضا کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ دوستی کی بھی ایک حد ہوتی ہے......"

"دوستی کی کوئی حد نہیں ہوتی......" اشرف کے لہجے میں دُکھ تھا۔ وحید خاموش ہو گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ وحید محسوس کر رہا تھا کہ رضوان اور ابو کے درمیان فاصلہ پیدا ہونے لگا ہے۔ اُن کے درمیان اب پہلے جیسا رابطہ نہیں رہا تھا۔

رضوان اپنے کام کے سلسلے میں دُوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ جب اُسے ایک تکلیف دینے والی خبر ملی۔ اشرف اپنی دُکان پر آرہا تھا جب سڑک عبور کرتے ہوئے ایک تیز رفتار گاڑی نے اُسے کچل دیا تھا۔ وہ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں موت اور زندگی کی کش مکش میں تھا۔ رضوان ہر کام کو نظر انداز کر کے ہسپتال چلا آیا۔ ڈاکٹر وحید سے کہہ رہا تھا۔

"خون کا انتظام کرو۔ مریض کی زندگی کو خطرہ ہے......"

وحید کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میرے جسم کا سارا خون نچوڑ لیجیے، لیکن میرے دوست کو زندگی ملنی چاہیے...... "رضوان آگے بڑھا۔

"موت اور زندگی کا مالک اللہ ہے۔ ہمارا کام تو کوشش کرنا ہے۔ میرے ساتھ آیئے......" ڈاکٹر رضوان کو اپنے ساتھ لیا گیا۔ اس سے پہلے کہ کوششوں میں تیزی آتی ایک جان لیوا خبر آ گئی۔

اشرف وفات پا گیا تھا۔ اشرف کی بیوی تو اپنے حواس ہی کھو بیٹھی تھی جب کہ وحید رضوان سے لپٹا رو رہا تھا۔

"صبر کرو میرے بچے!" رضوان اُسے دلاسا دے رہا تھا۔

"انکل! میرے ابو...... انکل! میرے ابو......"

دُکھ بہت بڑا تھا، لیکن صبر کی طاقت دُکھ سے بھی بڑی ہوتی ہے۔

اشرف کے نماز جنازہ میں اس کے رشتہ دار، دوست احباب سب ہی موجود تھے۔ ایسے میں امام صاحب نے اعلان کیا۔

"اشرف کی وفات کا ہم سب کو دُکھ ہے۔ انسان مر جاتا ہے اور اپنے اعمال ساتھ لے جاتا ہے۔ لیکن دُنیا کے معاملات چلتے رہتے ہیں۔ اب اشرف کا بیٹا وحید اُن کا وارث ہے۔ جس شخص کے ذمہ اشرف کا قرض باقی ہے وہ وحید سے رابطہ کرے۔ جسے جو لینا ہے جسے جو دینا ہے وحید سے مل کر معاملات طے کر لے۔"

اشرف کو فوت ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔ جب وحید نے دُکان کھولی تو رضوان اُس کے ساتھ تھا۔ لین دین والا رجسٹر دیکھ کر وحید کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس رجسٹر میں اُس کے ابو نے سارا کاروباری حساب لکھ رکھا تھا۔ لوگوں سے ادھار کی واپسی اسی رجسٹر کی مدد سے ممکن تھی۔ کام کا نئے سرے سے آغاز ہوا، لیکن کوئی بھی گاہک ادھار واپس نہیں دے رہا تھا۔ اب وحید نے لوگوں سے رابطے شروع کیے۔ سب ہی ادھار مال لینے کے بعد مکر گئے تھے۔ ان میں چند لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے کہا تھا کہ اشرف کو لے آؤ ہمارا معاملہ اُس سے تھا۔ ہم اُسی کو رقم دیں گے۔ بات لڑائی جھگڑے تک جا پہنچی تھی۔ کوئی مضبوط قانونی ثبوت بھی نہیں تھا۔ وحید ہمت



ہار بیٹھا تھا۔ فیکٹری والے رقم کا تقاضا کر رہے تھے۔ اور رقم لوگوں نے مار لی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ امید کی کوئی کرن نظر نہیں آرہی تھی۔ اشرف کی وفات کے ساتھ ہی کاروبار کا دیوالیہ ہو گیا تھا۔ مستقبل کی فکر نے وحید سے اُس کی راحت چھین لی تھی۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی تھی۔ ایسے میں رضوان آگیا۔ وحید نے بے دلی سے اُسے خوش آمدید کہا۔ رضوان اُس کے ابو کا دوست تھا۔ وہ دوست جو پچھلے مہینے اشرف سے قرض مانگنے آیا تھا۔ وہ دوست جس کی مدد اشرف نہیں کر پایا تھا اور وحید اس وجہ سے خوش بھی ہوا تھا۔ وہ دوست جس نے اشرف کی موت کے بعد اُس کے گھر والوں کی کوئی مدد نہیں کی تھی۔ رضوان وحید کے پاس بیٹھ گیا تھا اور وحید سوچ رہا تھا۔

"میرے ابو بھولے تھے انہوں نے ایسا دوست بنایا جو کسی کام کا نہیں تھا......"

ایسے میں رضوان کی آواز وحید کے کانوں سے ٹکرائی۔

"بیٹا! میں قرض لوٹانے آیا ہوں......"

ایک لمحے کے لیے وحید کو اپنے کانوں پر شک ہوا۔

"قرض...... کیسا قرض؟" وہ حیران رہ گیا۔

"بیٹا! تمہیں یاد ہو گا میں پانچ لاکھ روپے کی مدد لینے کے لیے تمہارے ابو کے پاس آیا تھا۔ آج میں وہ پانچ لاکھ روپیہ لوٹانے آیا ہوں......"

وحید کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ تو یہاں سے خالی ہاتھ واپس گئے تھے۔ میں گھر گیا تھا، لیکن مجھے امی سے رقم نہیں ملی تھی اور ابو نے کہا تھا کہ میں بہت جلد انتظام کر دوں گا۔ اور پھر ویسے بھی ابو کے لین دین والے رجسٹر میں آپ کو رقم دینے کا ذکر نہیں ہے......" وحید کہتا چلا گیا۔

رضوان مسکرا کر بولا۔

"وحید بیٹا! تم ابھی کم عمر ہو۔ دوستی کے رشتے کی نزاکت کو سمجھنے کے قابل نہیں ہو۔ دوستی میں پردہ ہوتا ہے، راز ہوتا ہے اور راز کی حفاظت ہوتی ہے۔ اشرف دوستی کی اس نزاکت کو سمجھتا تھا۔ اُس نے بہانے سے تمہیں گھر بھیجا تھا۔ وہ تمہاری غیر موجودگی میں میری مدد کرنا چاہتا تھا۔ اور اُس نے میری مدد کی اور ایسے کہ کسی کو خبر نہیں ہونے دی۔ اور آج میں وہ قرض لوٹانے کے قابل ہو گیا ہوں......" یہ سن کر وحید ششدر رہ گیا۔ وہ بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اشرف نے جن لوگوں کو قرض دیا تھا اُن میں اپنے بھی تھے اور بیگانے بھی تھے۔ سب کا ذکر رجسٹر میں موجود تھا۔ لیکن کئی قرض لوٹانے والے ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے کئی لوگ مکر گئے تھے۔ ایک رضوان تھا اور دُوسرا اشرف تھا۔ یہ نہ جانے کس زمانے کے لوگ تھے۔ ایک مدد کے نام پر قرض دیتا تھا اور کسی کو خبر نہیں ہونے دیتا تھا اور دُوسرا بغیر کسی ثبوت کے قرض واپس کرنے آیا تھا۔ وحید رونے لگا۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

"مجھے معاف کر دیجئے انکل! میں آپ لوگوں کی دوستی کو سمجھ ہی نہیں پایا تھا۔"

وحید کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔ اس رقم سے وہ اپنے ابو کے کام کو نئے سرے سے شروع کر سکتا تھا اور اپنے گھر والوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام کر سکتا تھا۔ قرض لوٹانے کے بعد رضوان وحید سے اجازت لے کر واپس جانے لگا تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

آج ایک راز نے دُوسرے راز کو جنم دیا تھا۔ وہ راز جو کبھی کھل نہیں پائے گا۔ وہ راز جو رضوان کے دل میں ہی دفن ہو کر رہ جائے گا۔ رضوان نے قرض کی جو رقم وحید کو واپس کی تھی وہ قرض رضوان کو کبھی ملا ہی نہیں تھا۔ رضوان نے اپنے دوست کے بیوی بچوں کی خوش حالی کے لیے اُن کی مدد کی تھی اور ایسی مدد جو اُس کے دوست کے اہل خانہ کے لیے شرمندگی کا باعث نہ بن جائے۔ رضوان سڑک کے کنارے پُر سکون انداز میں چلا جا رہا تھا۔ یہ وہ انسان تھا جس نے ایک ہاتھ سے دیا تھا اور دُوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہونے دی تھی۔ یہ وہ انسان تھا جس پر فرشتے ناز کر سکتے تھے کہ یہ انسان اُن سے بہتر ہے۔



☆ بچہ: "ڈاکٹر صاحب! کیا درد کے بغیر دانت نکالے جاسکتے ہیں؟"

ڈاکٹر: "جی نہیں۔"

بچہ: "نکالے جاسکتے ہیں۔"

ڈاکٹر: "وہ کیسے؟"

بچہ: "یہ دیکھئے، میں نکال کر دکھاتا ہوں۔ ہی ہی ہی...... ہاہاہا۔"

(ثمینہ عطاءاللہ، نوشہرہ)

☆ ایک دوست: "بارش تیز ہو گئی ہے، آپ رات یہیں گزار لیں۔"

دُوسرا دوست: "اچھی بات ہے، میں ذرا گھر والوں کو بتا آؤں۔"

(حاشر احمد، کراچی)

☆ ایک بے وقوف دُوسرے سے: "بھائی جیل کو حوالات کیوں کہتے ہیں؟"

دُوسرا: "کیوں کہ جیل میں کھانے کو صرف "ہوا" اور "لات" ہی ملتی ہے۔"

(اسامہ طارق، راول پنڈی)

☆ دیہاتی نے شہری سے پوچھا: "لیاقت کالونی کون سی ویگن جائے گی؟

شہری نے جواب دیا: "12 نمبر ویگن پر بیٹھ جانا۔"

ایک گھنٹے بعد شہری کا گزر وہاں سے ہوا تو دیہاتی وہیں کھڑا تھا۔

شہری نے کہا: "ابھی تک گئے کیوں نہیں؟"

دیہاتی بولا: "ابھی تک 9 ویگنیں گن چکا ہوں، جب 12 پوری ہو جائیں گی تو بیٹھ جاؤں گا۔"

(احمد مصطفیٰ، واہ کینٹ)

☆ ماں (بیٹے سے): "بیٹا! ہمیشہ مصیبت میں مسکرانا چاہیے۔"

بیٹا: "جی امی جان! اسی لیے تو میں ہر روز سکول جاتے ہوئے مسکراتا ہوں۔"

(اسامہ خان، بہاوَل پور)

☆ ڈاکٹر: "آپ کے گردے فیل ہو چکے ہیں۔"

مریض: "ڈاکٹر صاحب! آپ اچھا مذاق کر لیتے ہیں، میرے تو گردے کبھی سکول ہی نہیں گئے، فیل کیسے ہو گئے؟"

(فارحہ ظفر، رحیم یار خان)

☆ ایک نئے سیلز مین سے پرانے سیلز مین نے پوچھا: "کیوں بھئی کیسا لگ رہا ہے یہ کام؟"

نئے سیلز مین نے کہا: "پیسے تو مل جاتے ہیں بھائی، مگر اس کام میں کوئی عزت نہیں ہے۔ لوگ بے عزتی کر دیتے ہیں۔"

پرانے سیلز مین نے حیرت سے کہا: "تعجب ہے، مجھے تو یہ کام کرتے ہوئے دس سال ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے مجھے گالیاں ضرور دی ہیں، دھکے دے کر نکالا بھی ہے، مگر بے عزتی تو آج تک کسی نے بھی نہیں کی۔" (فہد فاروق، ملتان)

☆ گاہک: (ہوٹل کے بیرے سے) "یہ روٹیاں تو جل کر سیاہ ہو گئی ہیں۔"

بیرا: "یہ جلی ہوئی نہیں ہیں، آج ہمارے باورچی کا انتقال ہو گیا ہے، اُس کے سوگ میں کالی روٹیاں پکائی گئی ہیں۔"

(عبداللہ بٹ، گوجرانوالا)

☆ بیٹا: "ابو جی! ساتھ والے انکل اپنے بیٹے کو چاند اور تارا کہہ کر پکارتے ہیں جب کہ آپ مجھے الو یا گدھا کہہ کر پکارتے ہیں ایسا کیوں ہے؟"

باپ: "بیٹا! ساتھ والے انکل ماہر فلکیات ہیں اور میں جانوروں کا ڈاکٹر ہوں۔"

(قمر ناز دہلوی، کراچی)

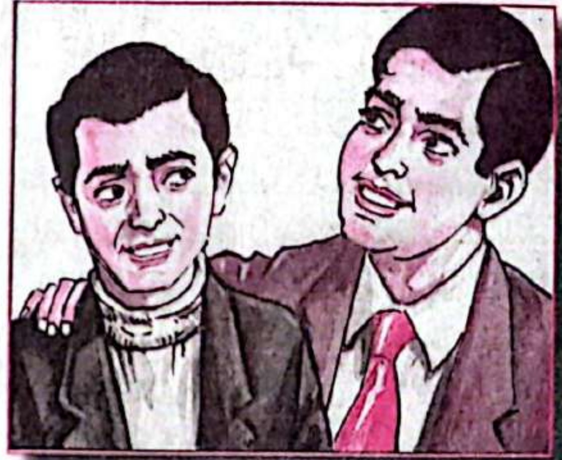


آخری اسٹیشن

(محسن حسن، لاہور)

پلیٹ فارم نمبر پانچ پر راولپنڈی جانے والی ٹرین کھڑی ہوئی تھی۔ سب مسافر ٹکٹ لینے کے لیے کھڑکی کی طرف بڑھے۔ چھوٹے سے کیبن میں بیٹھے ایک شخص نے اِس طرح مسافروں کی طرف دیکھا جیسے وہ کسی شکار کی تلاش میں ہو۔

''بھائی صاحب! تین ٹکٹ دے دیں۔''



''پہلے ٹکٹ مجھے دیں میں کافی دیر سے کھڑا ہوں۔'' دُوسرے مسافر نے کہا۔

''سب کو ٹکٹ مل جائے گا، بس صبر کرو۔'' ٹکٹ دینے والے شخص مراد کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔ مسافروں نے پیسے اس کی طرف بڑھائے تو وہ تیزی سے انہیں ٹکٹ دینے لگا۔ جب کافی مسافر ٹکٹ لے چکے تو اُس کی نظر ایک کونے میں بیٹھے ایک مسافر پر پڑی۔

''طفیل! اس شخص کو بلا کر لاؤ۔'' مراد کے کہنے پر طفیل مسافر کے پاس پہنچا۔

''آپ کو مراد صاحب بلا رہے ہیں۔''

''مراد صاحب۔'' مسافر نے دہرایا۔

''وہ سامنے والے کیبن میں مراد صاحب آپ کے منتظر ہیں، آپ جلدی آجایئے۔'' یہ سن کر مسافر کھڑکی کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں بعد مراد اپنے بچپن کے دوست عادل سے بغل گیر ہو رہا تھا۔

''اتنا عرصہ کہاں رہے، ان دنوں کیا کر رہے ہو، یہ داڑھی کب سے رکھی ہے؟'' مراد نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

''میٹرک کرنے کے بعد میں کوئٹہ چلا گیا تھا وہاں میں نے اپنے چچا کے ہاں رہ کر ایم اے اسلامیات تک تعلیم حاصل کی اور ان دنوں ایک مقامی کالج میں لیکچرار ہوں، میں نے داڑھی پانچ سال قبل رکھی تھی۔''

عادل نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک مسافر کھڑکی کے قریب آکر چلایا۔

''تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ، میں نے جب بھی تم سے ٹکٹ لیا ہے تم نے ہمیشہ جان بوجھ کر پیسے کم واپس کیے ہیں، آج بھی مجھے دس روپے کم ملے ہیں۔''

مراد نے خاموشی سے دس روپے مسافر کو تھما دیئے۔ عادل نے معنی خیز انداز میں اُسے گھورا۔

''بس یار یہاں تو رنگ رنگ کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ میں ان سے زیادہ بحث نہیں کرتا جو کہتے ہیں فوراً مان لیتا ہوں، تم سناؤ کہاں جا رہے ہو؟''

''کوئٹہ جانے کا ارادہ ہے، مگر معلوم ہوا ہے کہ ٹرین دو گھنٹے لیٹ چلے گی۔ میں نے اپنا سامان بھی بک کروانا ہے۔ آج کل گھریلو سامان کس حساب سے بک کیا جاتا ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

''تمہیں سامان بک کروانے کی کیا ضرورت ہے، میں ایک چٹ لکھ دوں گا بس تمہارا کام ہو جائے گا۔'' مراد نے مسکرا کر کہا۔

''وہ چٹ کیا آخری اسٹیشن تک کار آمد رہے گی؟'' عادل بولا۔

''ہاں، آخری اسٹیشن تک میری لکھی چٹ کار آمد

رہے گی، کوئی تم سے کچھ نہیں پوچھے گا۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"اس کے بعد تم سامان گھر لے جانا اور بس۔" مراد بولا۔

"اس اسٹیشن کے بعد بھی ایک آخری اسٹیشن آئے گا وہاں تمہاری چٹ نہیں چلے گی۔"

"یار! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کون سا آخری اسٹیشن؟" مراد نے عادل کی بات درمیان سے اُچک لی۔

"وہ آخری اسٹیشن اس وقت آئے گا جب ہم اپنی زندگی گزار کر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دیں گے۔ وہاں کوئی چٹ نہیں چلے گی، وہاں صرف اور صرف نیک اعمال کا سکہ چلے گا، میں چند روپوں کی خاطر نیکی کے اس سکے کو کھوٹا نہیں کرنا چاہتا۔ میں اپنے سامان کا پورا کرایہ ادا کروں گا۔" یہ سن کر مراد نے ایک نظر خود پر ڈالی تو اسے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی، اس کی آنکھیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات پر شرمندہ ہے۔

"میں آخری اسٹیشن کے لیے اپنے کھوٹے سکوں کو کھرا کرنے کی کوشش کروں گا۔" مراد نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

عادل اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"اللہ تمہیں کامیاب کرے۔"

(پہلا انعام: 200روپے کی کتب)

کبھی جیت کبھی ہار

(سلمیٰ صفی، ٹمن)

"اس دفعہ تو سب کھلاڑیوں نے مایوس کیا ہے۔" احمد نے اپنا ہاتھ نچا نچا کر کہا۔ وہ کرکٹ ٹیم کی کارکردگی پر تبصرہ کر رہا تھا۔

"احمد بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے، لگتا ہے تمام کھلاڑی بوڑھے ہو گئے ہیں۔" ثاقب نے اس کی تائید کی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ وہی احمد ہے جو کل تک پاکستانی ٹیم کو دُنیا کی سب سے بہترین ٹیم کہتا تھا آج وہی اپنی ٹیم کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔ میں دل ہی دل میں سوچتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔

"احمد! ذرا تفریح کے وقت میری بات تو سننا۔"

میں نے اگلے دن احمد سے بات کرنے کی ٹھانی۔ تفریح



کے وقت میں احمد کو لے کر کینٹین کی جانب چل پڑا۔

"احمد! دیکھو میری بات کا برا مت ماننا، تم آج کل پڑھائی پر بالکل توجہ نہیں دے رہے، تم بالکل نالائق ہو گئے ہو۔ اب دیکھو آج ٹیسٹ میں تمہارے 50میں سے 35 نمبر تھے۔" میری ترکیب نے الفاظ کا روپ دھارا۔

"کیا کہہ رہے ہو اسد! میں تو ہمیشہ اچھے نمبر لیتا ہوں۔ آج اس لیے اچھے نمبر نہ لے سکا کیونکہ میں گزشتہ دنوں بیمار تھا۔ اس لیے کچھ اسباق پڑھنے سے رہ گئے تھے۔" احمد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، مجھے تو لگتا ہے تم نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔"

"مجھے تو بہت حیرت ہو رہی ہے تم میرے بارے میں کیسے الفاظ استعمال کر رہے ہو، صرف ایک ٹیسٹ میں کم نمبروں کی وجہ سے تم نے مجھے نالائق کہہ دیا۔" احمد نے کہا۔

"یہی تو میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"کیا مطلب؟" احمد نے پوچھا۔

"کل تم پاکستانی کرکٹرز کو نالائق، بوڑھا، تھرڈ کلاس اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے، کیا انہیں اپنی شکست پر کوئی دُکھ نہیں ہوتا؟ یا انہیں سب کے سامنے ہارنے سے خوشی محسوس ہوتی ہے؟ اگر وہ ایک میچ ہار گئے تو تم نے اُن کی پچھلی کارکردگی کو بھلا دیا۔ میں نے تو تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے نالائق کہا کہ اگر ہم جیت کر خوشی محسوس کرتے ہیں تو ہم میں ہار اور شکست سہنے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے کیونکہ ہار اور جیت تو کھیل کا حصہ ہے۔" میں نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

"اسد! تم واقعی میرے بہترین دوست ہو۔ تم نے میری

آنکھیں کھول دیں ہیں، میں اپنے الفاظ پر بہت شرمندہ ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی کرکٹ ٹیم کو برا نہیں کہوں گا۔" احمد نے کہا۔

(دُوسراانعام: 175 روپے کی کتب)

محنت میں عظمت

(بلال شفیق، لاہور)

ہمارے گھر کے قریب ہی کرسیاں بننے والا ایک آدمی رہتا تھا۔ اس کا نام اکرم تھا۔ ہم سب اُسے اکرم بھائی کہتے ہیں۔ اکرم بھائی نابینا تھے، لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ نابینا ہونے کے باوجود وہ نہایت مہارت سے کرسیاں بنتے تھے۔

ایک دن میرے ابو نے انہیں دو کرسیاں بننے کو دیں۔



جب میں کرسیاں لینے گیا تو وہ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں کافی دیر ان کی تلاوت سنتا رہا۔ جب انہوں نے تلاوت ختم کی تو میں اُن کے پاس گیا اور سلام کرنے کے بعد پوچھا کہ آپ نابینا ہونے کے باوجود قرآن شریف کس طرح پڑھ لیتے ہیں۔ میری اس بات پر وہ اپنی کہانی سناتے ہوئے بولے۔

"میں نے پندرہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ میرے والد بھی کرسیاں بننے کا کام کرتے تھے۔ میں نے یہ کام اپنے والد سے سیکھا ہے۔ میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ کرسیاں بننے کا کام بھی کرتا تھا۔ ایک دن موم بتی سے گھر میں آگ لگ گئی۔ اس وقت میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میرا چہرہ جھلس گیا اور میں ہمیشہ کے لئے نابینا ہو گیا۔ میری عمر اس وقت سترہ برس تھی، میں خوش قسمتی سے قرآن حفظ کر چکا تھا، میں نے ارادہ کیا کہ میں معاشرے پر بوجھ بننے کی بجائے ایک کارآمد شہری بنوں گا۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے والد کے ساتھ محنت کرتا رہا۔ اب میں نابینا ہونے کے باوجود آسانی سے کرسیاں بُن لیتا ہوں۔ آنکھوں کی روشنی چلی جانے کے بعد اگر میں ہمت ہار بیٹھتا تو کبھی اس مقام تک نہ پہنچ پاتا۔ جو انسان ہر مشکل کا مقابلہ جواں مردی سے کرتے ہیں وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔"

میں اکرم کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔

(تیسراانعام: 125 روپے کی کتب)

چراغ

(آمنہ الیاس، فیصل آباد)

حضرت عمر بن عبدالعزیز خاندانِ بنو امیہ کے بہت نیک، پرہیزگار اور انصاف پسند خلیفہ تھے۔ جب آپ خلیفہ بنے تو بیوی کا سارا زیور بیت المال میں جمع کرا دیا وہ اپنے ذاتی خرچ کے لئے سرکاری خزانے سے صرف دو درہم روزانہ لیتے تھے اور نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور رات دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اتنے میں تیل ختم ہو جانے کی وجہ سے چراغ بجھ گیا۔ آپ کا خادم قریب ہی سو رہا تھا۔ مہمان نے کہا۔

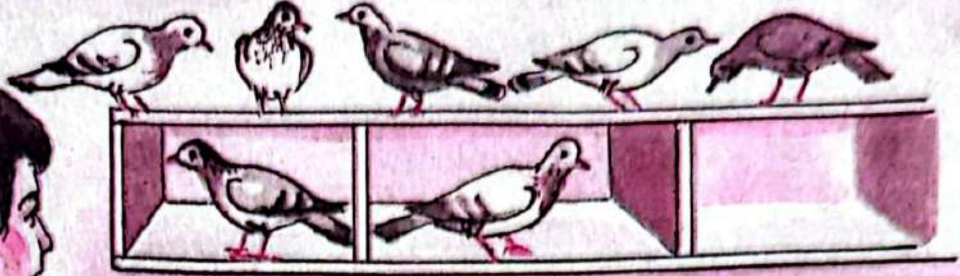
"اجازت ہو تو خادم کو اٹھا دوں تاکہ وہ اٹھ کر چراغ روشن کر دے۔"

آپ نے جواب دیا: "نہیں، خادم کو جگانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

مہمان نے کہا: "تو میں چراغ روشن کر دیتا ہوں۔"

آپ بولے: "نہیں آپ میرے مہمان ہیں اور مہمان سے کام لینا مروت کے خلاف ہے۔ میں خود چراغ روشن کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے چراغ میں تیل ڈالا اور اسے روشن کر دیا۔ پھر آپ مہمان کے پاس آبیٹھے اور کہا۔ "میں جب اٹھ کر گیا تو تب بھی عمر تھا اور چراغ جلا کر واپس آنے کے بعد بھی عمر ہی ہوں، اپنا کام کرنے سے کسی کی شان میں فرق نہیں آتا۔" (اعزازی تحریر)







شیرو واپس آگیا

پروفیسر محمد ظریف خان (کراچی)

چڑ گوٹھ میں رہنے والے دس سالہ علی داد کو کبوتر پالنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس کے پاس دو درجن سے زائد کبوتر تھے، جن کی دیکھ بھال پر وہ گھنٹوں صرف کیا کرتا۔ اس کے پاس شیرازی، کل سرے، لالوں لال، چتکبرے، لوٹ پوٹ اور کچھ بالکل سفید دودھیا رنگت کے کبوتر تھے۔ اس کا گوٹھ اب تو چھوٹا سا شہر بن چکا تھا۔ بجلی آنے کے بعد گاؤں کے اکثر گھروں میں ٹی وی کے ساتھ کیبل بھی لگ چکی تھی۔

اب وہ دور نہیں تھا جب صرف وڈیرے، چوہدری یا نمبردار کے گھر میں بیٹری سیل سے چلنے والا ہاتھی جیسا ریڈیو ہوتا تھا، جہاں پنڈ یا گوٹھ کے بچے ۸ بجے شب آؤ بچو! کہانی سنو والے پروگرام میں نشر ہونے والی کوئی دل چسپ کہانی سن کر اپنے اپنے گھروں کو جائیں اور بستر پکڑ کر خوابوں میں کھو جائیں۔ اب تو بچے آدھی آدھی رات تک کارٹون فلمیں دیکھتے اور صبح مشکل سے آنکھیں ملتے ہوئے سکول جانے کے لیے بیدار ہوا کرتے، مگر قصور ان بچوں کا نہیں ان کے بڑوں کا تھا جو ٹی وی دیکھنے کی دھن میں مگن ہو کر رات رات بھر اپنا شوق پورا کیا کرتے، مگر پانچویں جماعت پڑھنے والے علی داد کو ایسا کوئی شوق نہ تھا۔ وہ اپنے کبوتروں کی خدمت میں لگا رہتا، اُس نے اپنے کبوتروں کے مختلف نام رکھے ہوئے تھے۔ اور وہ کبوتر بھی اپنے ناموں سے آشنا تھے۔ چوں کہ علی داد کے پاس زیادہ تر کبوتر اونچی اور لمبی اڑان والے تھے اس لئے اس نے تمام کبوتروں کے پروں پر شناخت کی خاطر مہندی سے ع۔ د لکھ رکھا تھا۔ جب ان حروف کا رنگ پھیکا پڑتا تو علی داد اسے تازہ مہندی سے دوبارہ رنگین کر دیا کرتا تھا۔

اس کا چھٹی والا دن تو کبوتروں کے لئے وقف ہوا کرتا تھا۔ اگر وہ کبھی ٹی وی دیکھتا بھی تو اپنے لیے ایسے چینل کا انتخاب کرتا جس میں پرندوں اور جانوروں سے متعلق فلمیں لگتی تھیں۔ ایک بار چھٹی کے دن دوپہر کے وقت ڈسکوری چینل سے کبوتروں کے بارے میں تقریباً دو گھنٹہ طویل ایک معلوماتی پروگرام نشر ہوا تو وہ دوپہر کا کھانا کھانا بھی بھول گیا۔

علی داد کا یہ شوق اس کی پڑھائی پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھا اور اس کے کاشت کار باپ ولی داد کو یہ امید تھی کہ وہ پانچویں جماعت کے سالانہ امتحانات میں اول آ کر وظیفہ حاصل کرے گا۔ لیکن اس کا خواب اس وقت چکنا چور ہو گیا جب علی داد نے ششماہی امتحانات میں ساتواں درجہ حاصل کیا۔ تب ولی داد نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ علی داد پر پابندی عائد کرے گا۔ اس نے تمام کبوتر فروخت کرنے کا اعلان کر دیا۔ علی داد یہ بات سن کر خوب رونے پیٹنے اور شور مچانے لگا

تو ولی داد نے اسے صرف چار کبوتر رکھنے کی اجازت دے دی۔ یہ چاروں کبوتر بندو، ننو، شیرو اور ٹیٹی علی داد کو سب سے زیادہ پسند تھے۔ باقی کبوتروں کو ولی داد نے اچھی قیمت پر بیچ ڈالا۔ کبوتروں کی تعداد کم ہونے سے علی داد کو وافر وقت ملنے لگا اور اس نے محنت کر کے پانچویں جماعت کے سالانہ امتحانات میں اول درجہ اور وظیفہ حاصل کر لیا۔ اس روز علی داد سے زیادہ ولی دار خوش ہو رہا تھا۔

ایک دن شیرو کبوتر نے ایسی لمبی اڑان لی کہ واپس ہی نہیں آیا۔ خدا جانے کسی نے پکڑ لیا یا پھر اُسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ شیرو کی گمشدگی پر علی داد نے بہت آنسو بہائے۔ ولی داد نے اسے تسلی دیتے ہوئے ایسا ہی ایک اور کبوتر لا کر دینے کو کہا، مگر علی داد اس بات پر راضی نہ ہوا اور وہ اپنے شیرو کو یاد کر کے روتا رہا۔

اب علی داد قصبے سے کچھ دُور ایک بڑے شہر کے انگریزی ذریعہ تعلیم والے سکول میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ قصبے کے چند صاحبِ حیثیت خان دانوں کے بچے بھی وہیں پڑھ رہے تھے جنہیں سکول وین لینے اور واپس پہنچانے کے لئے آیا کرتی تھی۔ سکول اس کے قصبے سے کوئی سات آٹھ کلو میٹر دُور تھا اور علی داد کو صبح تڑکے ہی وین میں سوار ہونا پڑتا تھا۔ سکول آنے جانے کا سفر ہنستے کھیلتے گزر جایا کرتا تھا۔ راستے میں ہرے بھرے کھیت اور اڑتے ہوئے جنگلی کبوتر دیکھ کر علی داد بہت خوش ہوا کرتا۔ اُسے اپنے سرسبز کھیت دیکھ کر بڑی طمانیت ملتی تھی۔ طویل سفر کی تھکن اور اضافی وقت کی وجہ سے علی داد کو کبوتروں سے کھیلنے کا وقت بھی کم ملنے لگا، مگر اس کی دل چسپی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ شیرو ابھی تک غائب ہی تھا، لیکن علی کے دل سے اس کی یاد محو نہیں ہوئی تھی۔ وہ شیرو کو اکثر یاد کرتا اور اس کے آنے کی دُعائیں بھی کیا کرتا۔ تین ماہ کے بعد بھی شیرو اس کے دل میں بستا تھا۔

اس دوران ولی داد کو کھیتی باڑی میں کچھ نقصان اٹھانا پڑا۔ جب شہر میں رہنے والے اس کے ایک واقف کار کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے ولی داد کو مشورہ دیا کہ کاشت کاری فضول کام ہے دن رات محنت کرنے کے باوجود بھی سالانہ دو تین لاکھ روپے سے زائد کی آمدنی نہیں ہو پاتی۔ بہتر یہ ہو گا کہ وہ اپنی زمین، مال مویشی اور مکان بیچ کر شہر میں آجائے اور یہاں کوئی کاروبار کرلے۔ ولی داد نے یہ سوچے بغیر کہ نقصان تو کاروبار میں بھی ہو سکتا ہے شہر میں مستقل رہائش اور کاروبار کرنے کی



ہامی بھرنے کے بعد اپنا مال و متاع فروخت کرنے کے انتظامات شروع کر دیتے۔ علی داد کو اپنے گاؤں، وہاں کے ماحول اور دوستوں سے بڑا پیار تھا۔ جب اسے اس بات کا پتہ چلا کہ اس کا باپ ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑ کر جا رہا ہے تو اُسے بڑا دکھ ہوا، مگر وہ اپنے باپ کو بھلا کس طرح روک سکتا تھا؟

ایک شام علی داد اپنے گھر کے صحن میں برگد کے درخت تلے بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا جب کہ اس کے ماں باپ اور دونوں چھوٹی بہنیں سبین اور نویل اندر ایک کمرے میں بیٹھی تھیں۔ ولی داد کے سامنے مکان اور زمینوں کے کاغذات پڑے تھے اور وہ اس حوالے سے اپنی بیوی کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ اسی وقت علی داد نے درخت پر کسی پرندے کی آمد اور پروں کو پھڑ پھڑانے کی زور دار آواز سنی۔ اس نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا تو اُسے درخت کی ایک شاخ پر ایک کبوتر بیٹھا دکھائی دیا جسے دیکھ کر بے ساختہ اس کے منہ سے خوشی کے مارے ایک چیخ نکل گئی...... وہ شیرو تھا...... علی داد شیرو کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گیا۔ اس نے اپنی مخصوص آواز میں شیرو کو پکارا تو وہ اڑ کر اس کے کاندھے پر آ بیٹھا۔ علی داد نے شیرو کو کاندھے سے اتارا اور اسے خوب پیار کیا اور پھر فرط مسرت سے بے قابو ہو کر اندر کمرے میں داخل ہو گیا۔

"بابا دیکھئے......! شیرو واپس آگیا۔ ماں......! شیرو واپس آگیا...... سبین! شیرو آگیا...... نویل! دیکھو شیرو واپس آگیا۔" وہ شور مچا مچا کر سب کو بتا رہا تھا۔ سبھی شیرو کی واپسی سے بہت خوش ہوئے، مگر کچھ دیر بعد علی داد کی خوشیاں ماند پڑ گئیں اور وہ اداس ہو گیا۔ اس کی یہ اداسی دیکھ کر ولی داد نے پوچھا۔

کیا بات ہے بیٹا! تم کیوں خاموش ہو گئے......؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ شیرو تو صرف تین مہینے بعد گھر واپس آگیا، مگر ہم تو یہ گھر اور یہ گاؤں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر کہیں اور جا رہے ہیں۔"

ننھے علی داد کے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر ولی داد نے حیرت بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ اُس نے چند لمحوں تک کچھ سوچا اور پھر کاغذات کو ایک آہنی صندوق میں رکھ کر علی داد کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔ اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا...... گاؤں نہ چھوڑنے کا فیصلہ۔

---☆☆---

کرنیں

سچائی گلاب سے زیادہ مہکتی ہے۔

علم کو یاد رکھنا ذہانت اور عمل کرنا عبادت ہے۔

شرک کے بعد دُوسرا بڑا گناہ والدین کی نافرمانی ہے۔

محبت کے ایک بول سے نفرت کو شکست دی جا سکتی ہے۔

اپنی ضرورتوں کو محدود کر لینا ہوش مندی ہے۔

دُنیا میں تمام چیزوں کی حد ہے سوائے علم کے۔

جدوجہد کا دامن مت چھوڑو اور ہر وقت کوشش کرو ایک دن کام یابی سے ہمکنار ہو گے۔

انداز اور قیاس پر بات نہ کیا کرو کیوں کہ اس طرح انسان نفرت، غلط فہمی اور جھوٹ پھیلانے کا باعث بنتا ہے۔

محنت ایک تتلی ہے، جو کام یابی کے پھولوں پر بیٹھتی ہے۔

(قمر ناز دہلوی۔ کراچی)



گڑیا گھر

شازیہ فرحین (کراچی)

"چھوٹی بی بی! میں آپ کے گڑیا کے گھر کی صفائی کر دوں؟" زینب نے تیکھی نظروں سے گڑیا گھر کو دیکھا۔

"ہونہہ کیا کہا......!" نائلہ نے نقاہت سے پوچھا۔

"جی میں آپ کے گڑیا کے گھر کی صفائی کر دوں، دیکھیں کتنی گرد میں اٹا ہے۔" زینب نے اب کی دفعہ اونچی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے کر دو، لیکن خیال رہے کوئی چیز ٹوٹنے نہ پائے۔" نائلہ بخار کے بعد صحت یاب ہو چکی تھی، مگر کمزوری ابھی برقرار تھی۔

"چھوٹی بی بی! اگر آپ اجازت دیں تو ٹب میں صابن کا پانی بھر لاؤں، دیکھیں الماری، سنگھار میز، صوفہ اور کرسیاں سب بہت گندی ہو رہی ہیں صرف صفائی سے کام نہیں چلے گا" زینب نے کہا۔

"ٹھیک ہے لے آؤ مگر ذرا احتیاط سے۔" نائلہ نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

زینب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ دوڑی دوڑی باتھ روم تک گئی اور جلد ہی چھوٹے سے ٹب میں پانی بھر کر لے آئی۔

"چھوٹی بی بی! آپ دیکھیے گا آپ کے اس گڑیا گھر کو میں چاندی کی طرح چمکا دوں گی۔"

زینب نے انتہائی شوق سے کہا اور ننھے سے کپڑے سے ننھی منی چیزیں صاف کر کے پانی سے نکالتی گئی۔ اس دوران اس کی گنگناہٹ بھی جاری تھی۔

چھوٹی سی گڑیا کا چھوٹا سا گھر
منا سا گھر پیارا سا گھر

"اب صفائی ہو چکی ہو تو یہاں سے چلی جاؤ میں سونا چاہتی ہوں، بہت شور مچا رہی ہو۔" نائلہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"چھوٹی بی بی! معاف کیجیے گا مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

زینب نے منہ پر دوپٹہ رکھ کر بے ساختگی سے کہا اور جلدی جلدی گڑیا کا گھر صاف کر کے باہر نکل گئی۔

"کتنا خوبصورت تھا چھوٹی بی بی کا گڑیا گھر، ننھی ننھی کرسیاں، چھوٹا سا بستر، سنگھار میز، غسل خانہ اور کچن، کاش یہ سب چیزیں میرے پاس بھی ہوتیں۔"

اُس کے دل میں ایک ننھی سی خواہش اُبھری اور آج رات اس نے ٹھان لی کہ وہ اماں سے ایسے گڑیا گھر کی فرمائش ضرور کرے گی۔

رات کا سناٹا پھیلا تو وہ اماں کے پہلو میں آ کر لیٹ گئی اور پھر پیار سے اماں کے گالوں پر اپنے ننھے ہاتھ پھیرنے لگی۔

"آج اتنا پیار کیوں آرہا ہے؟" اماں نے ہنس کر کہا۔

"اماں! وہ دراصل میں یہ چاہتی ہوں کہ چھوٹی بی بی کی طرح کا گڑیا گھر میرے پاس بھی ہو۔"

"لک لک کیا کہا او میری گڑیا رانی! تجھے میرے حالات کا تو علم ہے پھر تو ایسی فرمائش کیوں کرتی ہے جو تیری ماں پوری نہ کر سکے، جانتی ہے صاحب کہہ رہے تھے کہ گڑیا گھر پورے ایک ہزار روپے کا آیا ہے، میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تجھے گڑیا گھر لے کر دے سکوں، بس تُو چپ کر کے لیٹ جا اور آئندہ ایسی چیزوں پر نظر بھی نہ رکھا کر جس سے تیرے دل میں کوئی خواہش اُبھرے۔"

اماں نے ڈانٹ کر اسے سمجھایا۔ اک لمحے کو وہ چونکی اور پھر اماں کی بیچارگی پر دھیرے سے گردن ہلا دی۔

اُسے رات بھر نیند میں گڑیا گھر کے خواب دکھائی دیتے رہے، کبھی وہ بے چینی سے کروٹ بدل لیتی تو کبھی ایک آنسو بہا کر اپنے دل کو تسلی دیتی۔

وہ صبح اُٹھی تو بے ساختہ اس کے قدم طاہر صاحب کے بنگلے کی طرف اُٹھ گئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چھوٹی بی بی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اُس نے کھڑکی سے جھانکا۔ بی بی گہری نیند میں تھیں جب کہ گلابی رنگ کا گڑیا گھر ایک طرف سجا سجایا رکھا تھا۔

وہ دُوسری طرف مڑ گئی تاکہ چھوٹی بی بی اُسے نہ دیکھ لیں۔

اب وہ ماں کے ساتھ گھر کی صفائی ستھرائی میں مشغول تھی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے جھاڑو تھامے وہ بہت چست نظر آتی تھی۔

پھر بلاوجہ اُس کے قدم گڑیا گھر کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ وہ گڑیا گھر کی کشش سے سخت پریشان تھی۔

"چھوٹی بی بی! آپ سیما باجی کے گڈے سے اپنی گڑیا کی شادی کر دیں۔" زینب نے مشورہ دیا۔

"مگر کیوں؟" نائلہ نے سختی سے کہا۔

"آپ کے پاس دراصل گڑیا کے گھر میں جہیز کا بہترین سامان ہے بس اس لیے یہ خیال آ گیا۔" زینب نے دھیرے سے کہا۔

"اپنے مشورے اپنے پاس رکھا کرو اور میرے گڑیا گھر پر نظر رکھنے کی ضرورت نہیں۔"

نائلہ کے لہجے میں غصہ تھا، جواب میں زینب نے نظریں نیچے کیں اور صفائی میں مشغول ہو گئی۔



اگلی رات بھی اُسے نیند نہ آئی اور جب نیند آئی تو وہی گڑیا گھر اس کی نظروں کے سامنے تھا اور وہ اپنی سہیلوں کے ساتھ گڑیا گھر سے کھیل رہی تھی۔

ماں نے دیکھا وہ نیند میں مسکرا رہی تھی اور پھر آنکھ کھلتے ہی وہ سسکنے لگی۔ ماں نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

"کیا ہوا میری بچی؟" ماں نے تشویش سے پوچھا۔ اُس نے سسکتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور بڑبڑائی۔

"ماں! میرا گڑیا گھر کہاں گیا؟"

وہ نیند میں نہ جانے کیا کچھ بولنے لگی اور پھر جاگتی آنکھوں سے ماں کے سرہانے بیٹھ کر اپنا خواب سنانے لگی۔

پھر تو جیسے یہ خواب معمول سا بن گیا، مسلسل چار پانچ روز خواب نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

تین راتوں سے اُس کا بخار ہی نہ اترتا تھا، ماں کا پریشانی سے برا حال تھا۔ اس کے قدم کئی دفعہ سفید کوٹھی کی طرف اٹھتے اور جی چاہتا کہ چھوٹی بی بی کے کمرے سے وہ گڑیا گھر اُٹھا لائے جس کے سبب اس کی زینب بستر سے لگ گئی تھی، مگر پھر فطری جھجک آڑے آجاتی۔ غیرت اور خودداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے، میں بھلا کیسے یہ سب کچھ کروں، وہ سوچتے سوچتے کوٹھی کی طرف بڑھی، گھر میں زینب اکیلی تھی اُس نے باہر سے کنڈی چڑھائی تھی پھر بھی وہ بے چین تھی۔

کوٹھی پہنچ کر اس نے کام میں انتہائی پھرتی دکھائی۔ وہ تیزی کے ساتھ ہاتھ چلا رہی تھی تاکہ جلد از جلد واپس گھر جا سکے۔

"کیوں بھئی زینب کا بخار اب تک نہیں اُترا؟" بیگم صاحبہ نے اس سے پوچھا۔

"نہیں بی بی جی! اس کا بخار اب تک ویسا ہی ہے۔" اُس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"ڈاکٹر کو دکھایا تھا کہ نہیں؟" بیگم صاحبہ نے دریافت کیا۔

"نہیں بیگم صاحبہ! ہم غریبوں کو ڈاکٹر کی ضرورت نہیں پڑتی، بخار خود ہی اتر جائے گا۔" اس نے اتنا کہا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

آج زینب کے بخار کا پانچواں دن تھا۔ کمزوری اس پر بری طرح حاوی تھی۔ ماں آج بھی بنگلے میں گئی تھی، لیکن واپسی پر تو جیسے اس کے ہوش ہی اُڑ گئے۔

زینب بے ہوش تھی۔ بخار کی شدت سے اس کا پورا جسم تپ رہا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی کوٹھی تک آئی۔

"بیگم صاحبہ! زینب بے ہوش ہو گئی ہے۔"

ماں کے لہجے میں حد درجہ بے چارگی تھی۔ آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر تھا، وہ آٹھ سالہ زینب کو گود میں اٹھائے مدد کی منتظر تھی۔ بیگم صاحبہ نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا حکم دیا۔ نائلہ بھی دوڑتی ہوئی ان کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

ہنستی کھیلتی زینب بالکل بے سدھ تھی۔ جلد ہی وہ ہسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اُس کا معائنہ کیا اور چند ضروری ٹیسٹ کروائے۔ کچھ دیر کے بعد وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آ گئی۔ اس کے سرہانے نائلہ، بیگم صاحبہ اور اس کی ماں کھڑی تھیں۔

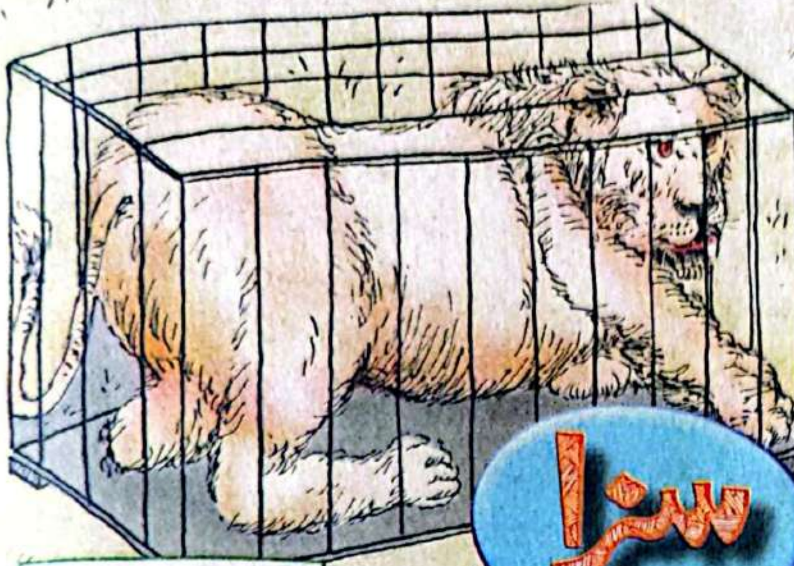
زینب نے اِدھر اُدھر پلکیں جھپکائیں اور پھر وہی بڑبڑاہٹ اُس کے لبوں پر جاری ہوئی۔

"ماں! میری گڑیا کا گھر بھی گلابی رنگ کا ہے، چھوٹی بی بی کی گڑیا کا گھر گلابی ہے آہا کتنا خوبصورت ہے وہ......" وہ نیند میں بڑبڑا رہی تھی۔ بیگم صاحبہ اور نائلہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی بڑبڑاہٹ سنتے ہوئے حیران ہو رہی تھیں۔ پھر ماں نے اس کے گڑیا گھر کے خواب اور پھر اس غم میں اس کے چڑھنے والے بخار کی پوری داستان انہیں سنا ڈالی۔

"تم نے پہلے ہمیں یہ بات کیوں نہیں بتائی۔" بیگم صاحبہ نے ناراضگی سے کہا اور پھر ڈرائیور صاحب کے ساتھ نائلہ کو بازار بھیجا۔

کچھ دیر بعد نائلہ کے ہاتھوں میں خوب صورت سے گفٹ پیک میں گلابی رنگ کا گڑیا گھر تھا۔

اُسی لمحے زینب نے آنکھیں کھولیں اور گڑیا گھر کو دیکھتے ہی اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کے موتی بکھرنے لگے۔ اُس کا بخار اب تیزی سے اُترتا جا رہا تھا۔ اُس کی امی، بیگم صاحبہ اور نائلہ کے چہرے پُر سکون تھے۔ وہ سب زینب کو خوش دیکھ کر خوش تھیں۔



سزا

نسرین نکہت سبزواری (لاہور)

ایک دن غریب لکڑہارا لکڑیاں کاٹنے کے لیے ایک جنگل سے گزر رہا تھا۔ اُسے کسی سوکھے درخت کی تلاش تھی۔ کسی ہرے بھرے درخت کو کاٹنا اُسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ لکڑیاں کاٹ کر بیچنا اُس کی روزی کا ذریعہ تھا۔ اُسے ہر حال میں لکڑیاں کاٹنا ہوتی تھیں ورنہ اس کے بیوی بچے بھوکے مر جاتے، لیکن پھر بھی اُس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ کسی سرسبز درخت کو نہ کاٹے۔ جب کبھی اُسے مجبوراً ایسا کرنا پڑتا تھا تو اُسے بہت دکھ ہوتا تھا۔ وہ کئی دنوں اُس ہرے بھرے درخت کو کاٹ کر اداس رہتا تھا۔ وہ جنگل سے گزر رہا تھا کہ اُسے کسی کے غرانے اور کراہنے کی آواز سنائی دی مگر اُس غراہٹ میں غصہ نہیں بلکہ تکلیف کا احساس نمایاں تھا۔ لکڑہارے نے اِدھر اُدھر دیکھا تو کچھ فاصلے پر اُسے لوہے کا ایک پنجرہ نظر آیا جس کے اندر ایک شیر بند تھا۔ لکڑہارا شیر کو دیکھ کر ڈر گیا لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ شیر تو پنجرے میں قید ہے وہ اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی راہ چل پڑا۔

"اے انسان! میری مدد کرو، مجھے یوں چھوڑ کر مت جاؤ۔"

شیر کی فریاد سن کر لکڑہارے نے پلٹ کر دیکھا۔

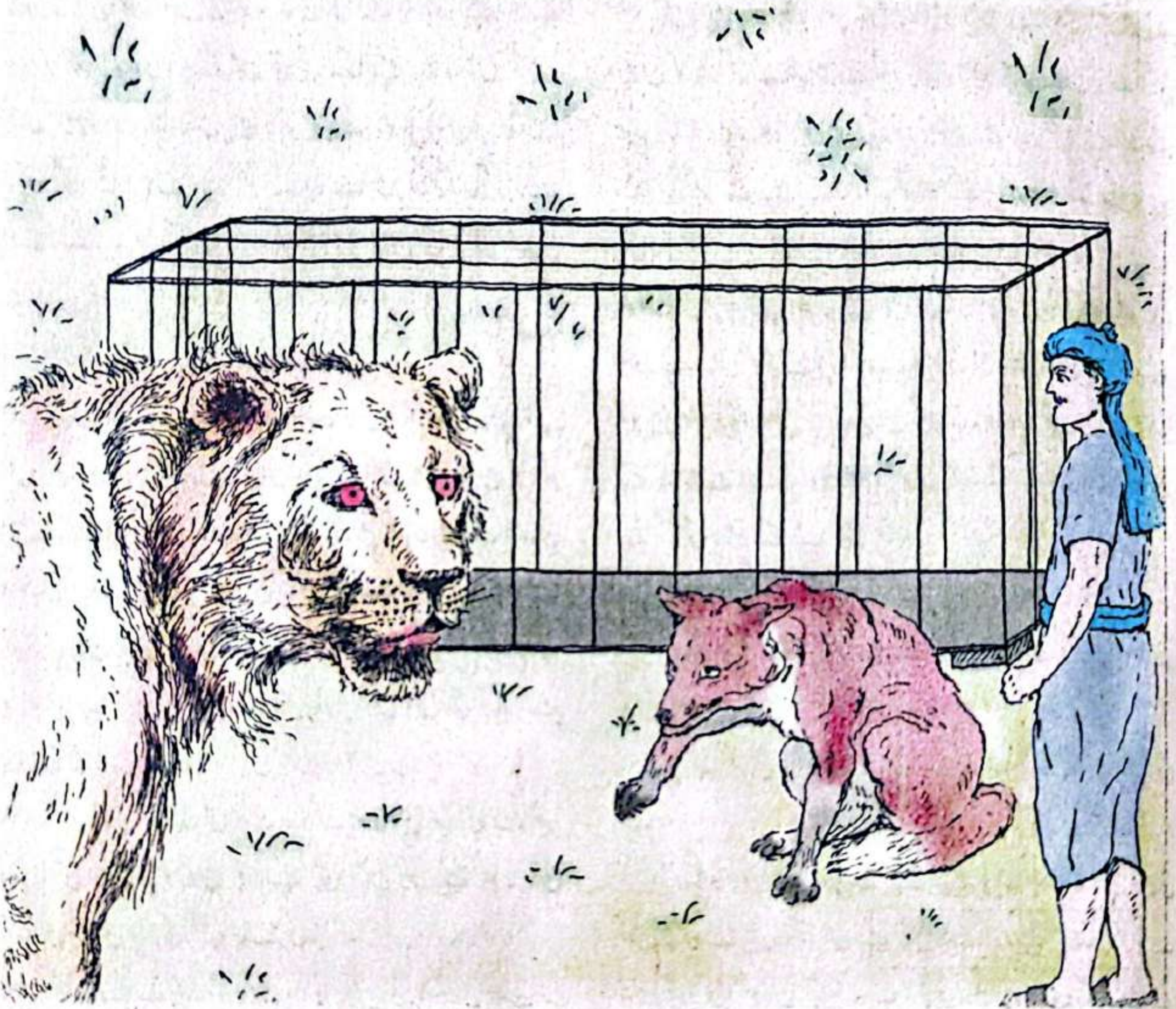
شیر واقعی بہت تکلیف میں تھا کیوں کہ وہ ایک بہت لمبا چوڑا، بھاری بھرکم ببر شیر تھا جب کہ پنجرہ اتنا چھوٹا تھا کہ وہ اس میں کھڑا ہونا تو درکنار پھیل کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت سکڑ کر بیٹھا ہوا تھا، جس سے اُسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ لکڑہارا اس کے پاس آیا تو اُس نے دیکھا کہ شیر تکلیف کے مارے کراہ رہا ہے اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ لکڑہارے کو دیکھ کر وہ بولا۔

"اے انسان! میں نے سنا ہے کہ تم لوگ بہت رحم دل ہوتے ہو۔ بلا ضرورت کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے اور کسی کو تکلیف میں دیکھ بھی نہیں سکتے۔ میرے بدن میں بہت درد ہو رہا ہے۔ پنجرے کی سلاخیں میرے جسم میں چبھ رہی ہیں۔ ٹانگیں بھی اکڑ گئی ہیں۔ میں گردن بھی سیدھی نہیں کر سکتا، مجھے اس پنجرے سے نکال دو۔ میں تمام عمر تمہارا غلام بن کر رہوں گا اور جو تم کہو گے وہی کروں گا، بس تم ایک بار میری مدد کر دو۔"

لکڑہارا بہت رحم دل اور نرم طبیعت کا مالک تھا۔ شیر کی آہ وزاری سن کر اُس کا دل بھر آیا۔ وہ شیر کو پنجرے سے آزاد کرنے لگا تو اس کے دماغ نے اسے ٹوکا کہ وہ کیا بے وقوفی کرنے جا رہا ہے۔ پنجرے سے نکلتے ہی شیر اس پر حملہ کر دے گا اور اس کے مرنے کے بعد اس کے والدین اور بیوی بچے بے

آسرا ہو جائیں گے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ واقعی وہ کتنی بڑی حماقت کرنے والا تھا۔ شیر تو انسان کا ازلی دشمن ہے اور یہ شیر تو پتہ نہیں کب سے قید ہے۔ یہ ضرور بھوکا ہی ہو گا۔ وہ پلٹ کر جانے ہی والا تھا کہ شیر زور زور سے رونے لگا۔ وہ بار بار دہرا رہا تھا کہ اگر اس نے شیر کی مدد کر دی تو وہ آزاد ہو کر اس کا بے دام غلام بن جائے گا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ لکڑہارے کی فطری رحم دلی اس کے دماغ پر حاوی ہو گئی۔ اُسے لالچ بھی ہوئی کہ وہ ایک عدد شیر کا مالک بن جائے گا۔ دُنیا میں اس کی کتنی شہرت ہو گی۔ بڑے بڑے لوگ اس سے ملنے آئیں گے۔ لکڑہارے پر لالچ غالب آگئی۔ اس سے پہلے کہ اس کا دماغ پھر اسے روکتا اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر پنجرہ کھول دیا۔ اس کا خیال تھا کہ شیر باہر نکلتے ہی اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو جائے گا اور وہ بڑی شان سے شیر پر سوار ہو کر اپنے گاؤں کا رخ کرے گا۔ وہ لوگ جو اسے غریب جان کر اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ خوف کے مارے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جائیں گے اور وہ بادشاہوں کی طرح انہیں نظر انداز کر دے گا۔ وہ انہیں کبھی خاطر میں نہیں لائے گا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہو سکا۔ شیر نے پنجرے سے باہر آتے ہی اس پر حملہ کر دیا۔ لکڑہارے نے بروقت چھلانگ کر اپنی جان بچائی۔

''شیر میاں! تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے کچھ نہیں کہو گے بلکہ ساری عمر میری غلامی کرو گے۔ یہ اچھی غلامی ہے تمہاری، تم تو میری جان کے درپے ہو گئے ہو، یہی صلہ ہے



میری نیکی کا؟"
شیر مکاری سے مسکرایا اور کہنے لگا۔
"واہ، واہ کیا کہنے ہیں، ایک چھوٹی سی نیکی کا یہ صلہ مانگ رہے ہو کہ میں جنگل کا بادشاہ ہو کر تمہارا غلام بن جاؤں، انسانوں سے زیادہ احسان فراموش، ظالم اور بدفطرت مخلوق کوئی نہیں۔ تم کب کسی پر رحم کھاتے ہو۔ اپنے محسنوں کا گلا سب سے پہلے کاٹتے ہو۔ یہی دیکھ لو کہ جانور اور درخت تمہاری کتنی خدمت کرتے ہیں۔ درخت تمہاری زمین کی خوب صورتی بڑھاتے ہیں۔ درخت تمہیں صاف ستھری ہوا فراہم کرتے ہیں اور تمہیں پھل اور پھول بھی دیتے ہیں اور تم انہیں اپنے ہاتھوں سے برباد کر کے آلودگی میں اضافہ کرتے ہو۔ چوری، ڈاکہ زنی اور قتل وغارت تمہارا پیشہ ہے۔ اور جانوروں پر تم ظلم کرتے ہو۔ مجھے ہی دیکھ لو۔ وہ بھی تو انسان ہی تھے جو مجھ جیسے بڑے شیر کو اتنے سے پنجرے میں قید کر کے چلے گئے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ میں کئی دنوں سے بھوکا ہوں۔ میرے بچے بھی کئی دنوں سے بھوکے پیاسے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہاتھ آئے شکار کو چھوڑنا کہاں کی عقل مندی ہے۔"
لکڑہارے نے روتے ہوئے کہا۔
"میں نے تمہارا بھلا کر کے بہت بڑی حماقت کی ہے۔ اب میں تمہاری اور تمہارے بچوں کی خوراک بن جاؤں گا مگر میرے بچے کیا کریں گے۔ خدا کے لئے تم کچھ تو میرے احسان کا خیال کرو۔ میں نے کبھی کسی جانور کو تنگ نہیں کیا۔ میں نے تمہاری جان بچائی ہے۔ تم میری جان بخش دو۔"
شیر یہ سن کر دہاڑنے لگا سارا جنگل اس کی دہاڑ سے لرزنے لگا۔
"تم انسان ہوتے ہی بہت چالاک ہو۔ اپنی عیاری سے شیر اور ہاتھی جیسے جانوروں کو اپنے قابو میں کر لیتے ہو۔ آج تمہاری ساری چالاکی نکل جائے گی۔"
لکڑہارے نے کہا۔
"تم بھی چالاک ہو۔ پہلے کیسے گڑگڑا کر میری خوشامد کر رہے تھے۔ مطلب نکل گیا تو کیسے آنکھیں پھیر لی ہیں، اچھا میری ایک بات مانو۔ وہ تھوڑے فاصلے پر ایک گائے کھڑی ہے۔ اس سے پوچھ لیتے ہیں۔ ہماری بات سن کر وہ جو بھی فیصلہ کرے گی مجھے منظور ہوگا۔"
شیر راضی ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ گائے بھی انسان کی ستائی ہوئی ہے۔ وہ بھی میرا ساتھ دے گی۔ شیر کا خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ پہلے تو گائے ان دونوں کو دیکھ کر سہم گئی مگر پوری بات سن کر اُس نے نفرت سے لکڑہارے کی طرف دیکھا اور غصے سے بولی۔
"ارے شیر بھائی! تم کس کے چکر میں آ رہے ہو۔ مانا کہ اس نے تمہاری تھوڑی سی مدد کر دی ہے۔ تم اس کے ظلم یاد کرو۔ ارے یہ انسان تو تمہارا جانی دشمن ہے۔ کبھی تو یہ تمہیں پکڑ کر چڑیا گھر میں بند کر دیتا ہے، کبھی تمہارے بچوں کو پکڑ کر لے جاتا ہے اور تمہارا شکار کر کے شہرت اور پیسہ کماتا ہے۔ وہ بھی تو انسانوں ہی تھے کہ تمہیں دھوکے سے قید کر کے چلے گئے۔ اگر تم بھوکے پیاسے مر جاتے تو وہ تمہاری لاش پر شکاری جوتوں والے پاؤں رکھ کر تصویریں بنواتے، پھر انہیں اخبار میں چھپواتے، تمہاری قیمتی اور خوب صورت کھال کو اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بناتے۔ تمہاری کھوپڑی کو دیواروں پر آویزاں کرتے اور مدتوں اپنے شکار کے کارنامے سناتے اور داد وصول کرتے۔ حالاں کہ انہوں نے تمہیں دھوکے سے پکڑا تھا۔"
گائے بولتی چلی گئی۔
"دیکھ لیا تم نے، تم لوگ کتنے ظالم ہو۔ میں تو ہرگز تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"
یہ کہہ کر شیر لکڑہارے پر حملہ کرنے والا تھا کہ وہ بول اٹھا۔
"دیکھو وہ ایک درخت کے نیچے ایک اونٹ اور گدھا کھڑے ہوئے ہیں۔ آؤ ان سے بھی بات کر لیتے ہیں۔"
شیر کو اطمینان تھا کہ بے وقوف لکڑہارا اس سے بچ کر

کہاں جاسکتا ہے۔ اگر بے چارہ انسان تھوڑی سی مہلت لینا چاہتا ہے تو لینے دو۔ جہاں اتنے دن بھوک برداشت کی ہے وہاں تھوڑی دیر اور سہی۔ اونٹ اور گدھا دونوں ہی انسان کے ستائے ہوئے تھے۔ گدھے کا مالک اس سے بے تحاشا کام لیتا تھا اور کھانے کو بھی پورا نہیں دیتا تھا اور بے دردی سے اس کی پٹائی بھی کرتا تھا۔ وہ اتنا کم زور تھا کہ اُس کی پسلیاں نظر آرہی تھیں۔ اس وقت بھی اُسے ایک درخت سے اس طرح باندھا گیا تھا کہ گردن کی رسی چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ نہ تو گردن بڑھا کر جھاڑیوں کے پتے کھا سکتا تھا اور نہ ہی گردن جھکا کر گھاس پھوس سے پیٹ بھر سکتا تھا۔ اونٹ کی کہانی بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔ وہ دونوں ہی انسانوں سے شدید نفرت کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ لکڑہارے کا شکار کر کے شیر زمین سے ایک برا انسان کم کر سکتا ہے۔ گدھا اور اونٹ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ ایک جھاڑی سے ایک لومڑی نکل آئی۔ لکڑہارے نے فوراً موقعہ غنیمت جانا اور لومڑی سے التجا آمیز لہجے میں بولا۔

"بی لومڑی! اب تم اتفاق سے آ ہی گئی ہو تو میری ایک بات مان لو۔ میں تمہیں اپنے مقدمے کا منصف بناتا ہوں مگر دیکھنا جانوروں کی حمایت میں غلط فیصلہ نہ دینا، جج کو انصاف پسند ہونا چاہیے۔"

ساری بات سن کر لومڑی آگے بڑھی اور بولی۔

"میں نے ساری باتیں سن لی ہیں لیکن شیر بھائی میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہی ہوں کہ تم ماشاء اللہ اتنے موٹے تازے اور لمبے چوڑے شیر ہو۔ تمہاری تو گردن اور سر کے بال بہت گھنے ہیں اس جسامت اور اتنے بڑے سر کے ساتھ تم پنجرے میں آ کیسے گئے اور یہ انسان بھی کہتا ہے کہ وہ پنجرہ تمہارے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے۔ میں تو کبھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتی۔"

لکڑہارا بے چارہ بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے یہی سوچ کر لومڑی کو جج بنایا تھا کہ بات چیت میں تھوڑا وقت اور گزر جائے۔ شاید اتنی دیر میں اللہ تعالیٰ کی مدد آجائے کہ وہ بڑا کار ساز ہے۔ اس نے بات کو طول دینے کے لیے کہا۔

"بی لومڑی! تم یقین کرو یا نہ کرو مگر یہ سچ ہے کہ میں نے ہی اس ظالم شیر کو پنجرے سے نکالا ہے اور یہ دُوسرے لوگوں کے جرموں کی سزا مجھے دینا چاہتا ہے حالاں کہ میں تو ایک بہت ہی کمزور اور بے ضرر انسان ہوں۔ میں نے تو آج تک ایک کیڑا بھی نہیں مارا۔ یہ شیر اس پنجرے میں قید تھا۔ مجھے دیکھ کر فریاد کرنے لگا کہ میری مدد کرو میں ساری عمر تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔ اب دیکھو مطلب پورا ہونے پر کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر مجھے آنکھیں دکھا رہا ہے۔ یہ مجھے مار کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنا چاہتا ہے۔ اسے یہ خیال نہیں کہ میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔"

یہ کہہ کر لکڑہارا بلک بلک کر رونے لگا، لیکن لومڑی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

"ارے تم انسان تو سدا کے دھوکے باز اور دغا باز ہو۔ کہانیاں بنانے میں تو تمہارا جواب نہیں۔ تمہاری بات پر تو میں یقین ہی نہیں کر سکتی۔ ہاں شیر بھائی تم سناؤ تم پر کیا بیتی اور کیسے بیتی.....؟"

شیر نے لکڑہارے کو گھور کر دیکھا اور بولا۔

"بی لومڑی! اگر کسی انسان نے اس دُنیا میں سچ بولا ہے تو سمجھ لو کہ یہ وہی شخص ہے یہ مجبوراً ہی سہی مگر بول سچ رہا ہے، لیکن اس کے ہم زادوں کے گناہ اتنے بڑے اور بے شمار ہیں کہ اسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔ بڑی مشکل سے آج نسلِ انسانی سے انتقام لینے کا موقعہ ہاتھ آیا ہے۔ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" وہ پھر لکڑہارے کی طرف لپکا۔

"ٹھہرو....." لومڑی نے کہا "اگر تم نے مجھے اپنے مقدمے کا منصف بنایا ہے تو مجھے صحیح بات کا پتہ ہونا چاہیے۔ کوئی جج اس وقت تک درست فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک اُسے تمام واقعات اور شواہد کا علم نہ ہو۔ اس مقدمے کی بنیاد ہی ایک مفروضے پر ہے۔ اس لئے شیر بھائی تم ثابت کرو کہ تم واقعی اس پنجرے میں قید تھے اور چونکہ تم ہی مدعی اور تم

ہی گواہ ہو اس لئے تمہیں یہ بات عملی طور پر ثابت کرنا ہو گی۔ اس کے بعد ہی مقدمے کی کارروائی ہو گی ورنہ مقدمہ خارج ہو جائے گا۔"

شیر سینہ تان کر آگے بڑھا۔

"یہ کون سی مشکل بات ہے۔ آؤ ہم اس پنجرے کے پاس چلتے ہیں اور میں تمہیں دکھاتا ہوں کہ میں واقعی اس چھوٹے سے پنجرے میں قید تھا۔ مجھے قید کرنے والے اس لکڑہارے کے بھائی بند تھے اس لئے میں اسے مار کر انسانوں سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔"

پھر وہ تینوں جنگل میں اُس جگہ پہنچے جہاں پنجرہ رکھا ہوا تھا۔ شیر فوراً اس پنجرے میں داخل ہو گیا اور بولا۔

"میں جنگل کا بادشاہ ہوں اور بادشاہ جھوٹ نہیں بولا کرتے۔"

لومڑی نے لکڑہارے کو اشارہ کیا اور اس نے بجلی کی سی تیزی سے پنجرے کا دروازہ بند کر دیا اور لومڑی کے ساتھ وہاں سے چل پڑا۔

"ارے، ارے تم لوگ مجھے اس پنجرے میں دوبارہ بند کر کے کہاں جا رہے ہو؟" شیر زور سے دہاڑا۔

"بادشاہ سلامت! آپ نے خود ہی کہا ہے کہ بادشاہ جھوٹ نہیں بولا کرتے اور جھوٹ بول بھی رہے ہیں۔ خدا گواہ ہے ہم نے آپ کو اس پنجرے میں قید نہیں کیا۔ آپ اپنی خوشی اور رضا سے اس کے اندر داخل ہوئے ہیں۔ آپ اُس مظلوم اور مجبور انسان کو کھانا چاہتے ہیں جس نے آپ کی جان بچا کر آپ پر احسان کیا تھا۔"

یہ کہہ کر بی لومڑی لکڑہارے کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور شیر حسرت سے انہیں جاتے دیکھتا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد شکاری ٹرک لے آیا اور شیر کو اس میں لاد کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اگر شیر احسان فراموشی نہ کرتا تو آج پنجرے میں قید ہونے کی بجائے جنگل میں آزاد گھوم رہا ہوتا۔ احسان فراموشی کرنے والوں کو ایسی ہی سزا ملتی ہے۔

قیمتی مجسمہ

ایک بادشاہ کو قیمتی نوادرات جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ جب بھی کوئی اُسے قیمتی چیز پیش کرتا تو وہ اُسے انعام ضرور دیتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ کو کسی نے تین مجسمے دیئے، تینوں مجسمے بظاہر بالکل ایک جیسے تھے، جب کہ مجسمے دینے والے کا کہنا تھا کہ تینوں مجسمے ایک جیسے نہیں ہیں۔ بادشاہ بہت پریشان ہوا کیوں کہ ان مجسموں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ اُس نے ملک کے ذہین لوگوں کو بلوایا اور تینوں مجسموں کے فرق کے بارے میں پوچھا، سب نے کوشش کی، مگر سب تینوں مجسموں میں فرق بتانے میں ناکام رہے۔

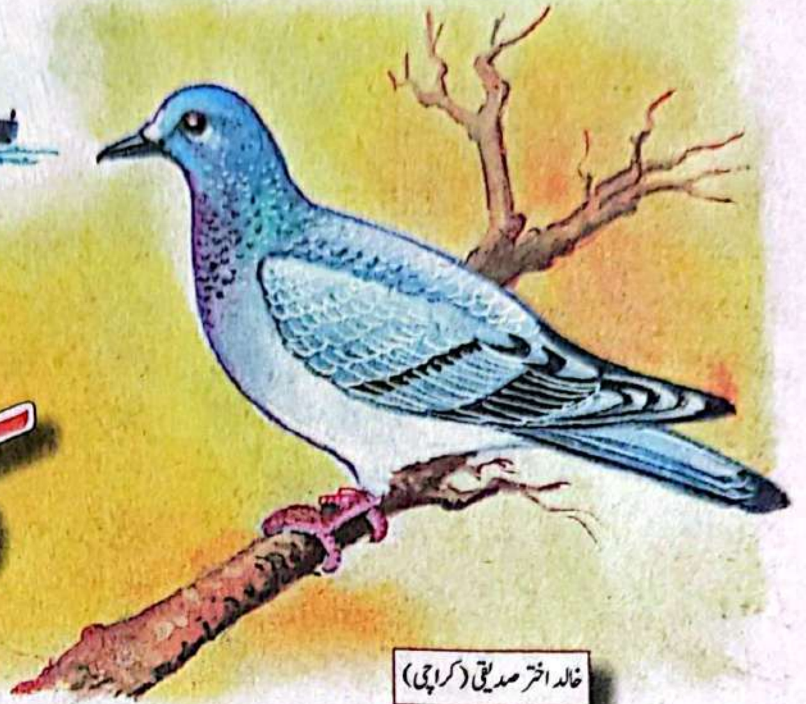
کچھ دنوں بعد ایک شخص بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور تینوں مجسموں میں فرق بتانے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر اس نے پانی منگوایا اور پہلے مجسمے کے کان میں ڈالا۔ بادشاہ اور تمام درباری حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، جب پہلے مجسمے کے کان میں پانی ڈالا تو وہ دُوسرے کان سے نکل گیا پھر اُس نے دُوسرے مجسمے کے کان میں پانی ڈالا تو وہ اُس کے منہ سے نکل آیا، تیسرے مجسمے کے ساتھ بھی اُس نے ایسا ہی کیا، مگر اس بار پانی نہ تو منہ سے نکلا اور نہ کان سے۔ اُس شخص نے فوراً کہا۔

"یہ سب سے قیمتی مجسمہ ہے۔" بادشاہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اُس شخص نے کہا۔ "پہلا مجسمہ ان لوگوں کی طرح ہے جو بات کو ایک کان سے سنتے ہیں اور دُوسرے سے نکال دیتے ہیں، دُوسرا مجسمہ ان لوگوں سے مطابقت رکھتا ہے جو بات کو سنتے ہیں اور منہ سے نکال دیتے ہیں اور لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں، تیسرا مجسمہ ان لوگوں میں سے ہے جو بات کو سن کر اسے سمجھتے ہیں اور اُسے اپنے لیے نصیحت جانتے ہوئے کام میں لاتے ہیں۔" بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے تینوں مجسموں میں فرق بتانے والے شخص کو انعام دے کر دربار سے رخصت کیا۔

شان قریشی (لاہور)

CamScanner





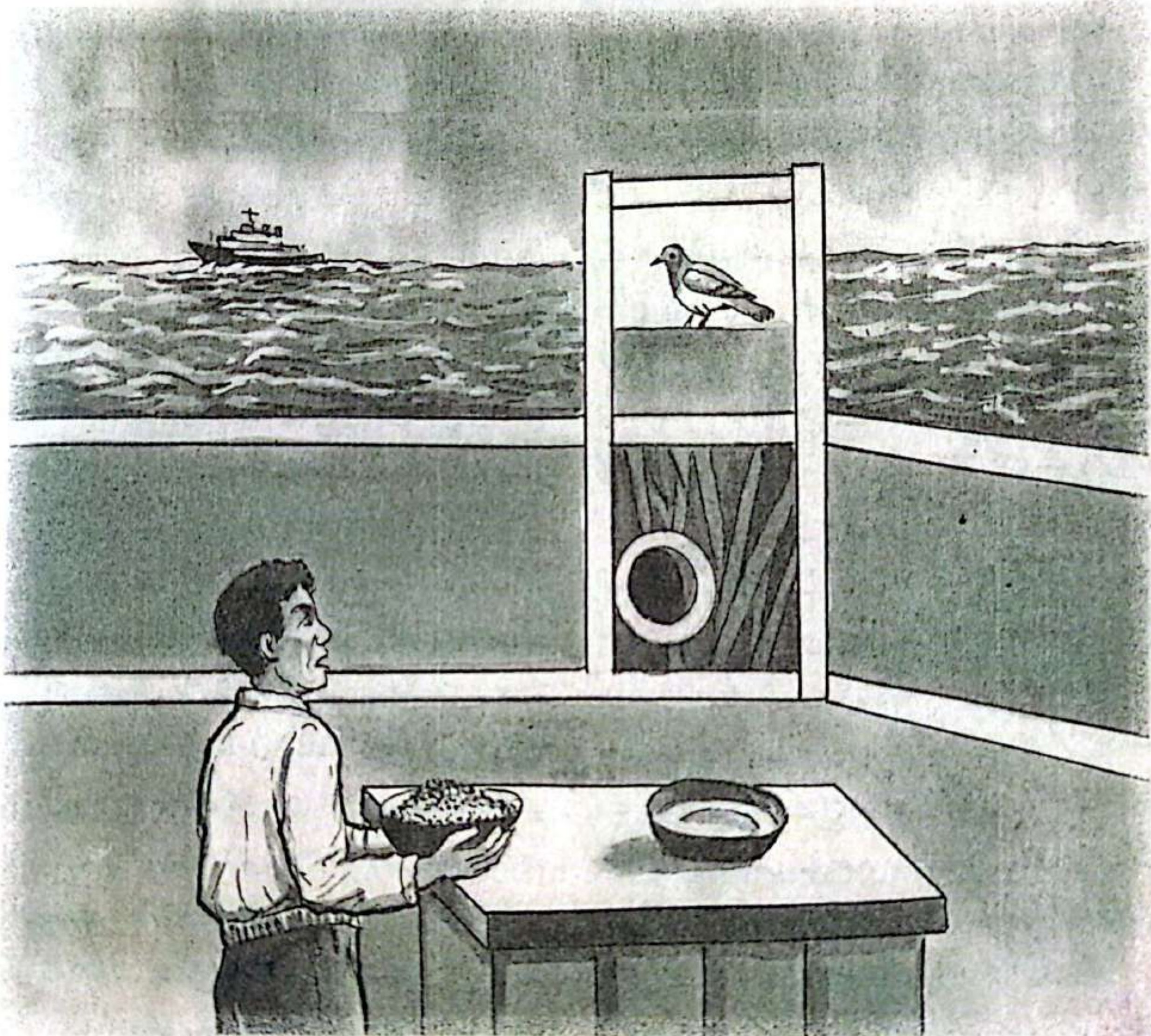
کبوتر کہانی

خالد اختر صدیقی (کراچی)

میں نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو نرم گرم گھونسلے میں پایا۔ میرے والدین نے مجھے اُڑنا اور دانہ دُنکا چگنا سکھایا۔ یہ گھونسلہ ایک تین منزلہ مکان کی چھت پر بنے ایک عارضی کمرے کے روشن دان میں تھا۔ اِس کمرے میں کوئی انسان نہیں رہتا تھا، بس اِس کمرے میں کاٹھ کباڑ اور پرانا سامان رکھا رہتا تھا۔ اس گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر سمندر تھا، جس میں ایک جانب بہت بڑی بندرگاہ تھی۔ یہاں مختلف ملکوں کے بحری جہاز تجارتی سامان لاتے اور لے جاتے تھے، ان جہازوں کے ہارن اتنی تیز بجتے تھے کہ دُور دُور تک ان کی آواز با آسانی سنی جا سکتی تھی۔ میں بھی اکثر ان ہارنوں کی آواز سے چونک جایا کرتا تھا۔ جب میں اچھی طرح اُڑنا سیکھ گیا تو میں اکثر بندرگاہ کے اس حصے میں چلا جایا کرتا تھا، جہاں یہ جہاز کھڑے ہوتے تھے، ان میں سے اکثر جہازوں پر مجھے وافر مقدار میں دانا دُنکا پڑا ہوا مل جایا کرتا تھا، جسے میں بڑی رغبت سے کھاتا تھا کیونکہ یہ عام دانے کی نسبت خاصا لذیذ ہوتا تھا۔ زندگی بہت آرام اور مزے سے گزر رہی تھی۔ میں اب اپنا زیادہ تر وقت بندرگاہ پر کھڑے جہازوں پر گزارا کرتا تھا۔

ایک شام میں نے بہت سارا دانہ دُنکا چگا اور اپنے گھونسلے کی طرف اُڑنے کا سوچا، اچانک مجھے شدید پیاس کا احساس ہوا، میں نے چاروں طرف پانی تلاش کیا، مگر پانی کہیں نہیں ملا تو میں ایک کیبن کی کھلی کھڑکی سے اندر داخل ہو گیا، وہاں ایک کھلے اور چوڑے منہ کے برتن میں پانی موجود تھا۔ کیبن میں روشنی نہیں تھی، میں بغیر دیکھے کہ پانی کیسا ہے چونچ ڈال کر غٹاغٹ پی گیا۔ مجھے اس کا ذائقہ کچھ عجیب سا لگا۔ اس میں سے بو آرہی تھی۔ میرا جی متلانے لگا اور جسم بھاری بھاری سا لگنے لگا۔ میں تیزی سے اُڑا اور کھڑکی کے راستے کیبن سے باہر نکل گیا، مگر یہ کیا میں اُڑنا کسی سمت چاہ رہا تھا اور اُڑ کسی اور سمت رہا تھا۔ اچانک مجھے چکر آنے شروع ہو گئے۔ سامنے ہی جہاز کے کیبن بنے ہوتے تھے۔ اِن میں ایک محفوظ سی جگہ پر میں مجبوراً گویا گر پڑا اور پھر میں بے سدھ ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ نہ جانے میں کتنی دیر بے ہوش رہا، پھر ایک عجیب سی تھرتھراہٹ سے مجھے ہوش آیا تو مجھے اپنا سر بھاری بھاری سا محسوس ہو رہا تھا، کافی دیر تک میں بے سدھ سا لیٹا رہا تب کہیں جا کر میں اس قابل ہو سکا کہ پرواز کر سکوں۔ میں نے اپنے گردوپیش پر نگاہ دوڑائی تو مجھے لگا گویا سمندر چل رہا ہو پھر اچانک مجھ پہ یہ انکشاف ہوا کہ جس جہاز کے کیبن پر میں بیٹھا ہوا تھا وہ جہاز

سمندر میں محوِ سفر تھا۔ ایک دم میں نے سمندر پر اندازے سے ایک سمت پرواز شروع کر دی، مگر وہ بندر گاہ یا ساحل کہیں نظر نہ آیا، جس جگہ سے یہ جہاز روانہ ہوا تھا۔ پھر میں نے اندازے سے ہی چاروں سمت پرواز شروع کر دی، مگر ہر سمت مجھے سمندر کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں اب تھک چکا تھا، مگر نیچے سمندر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے کافی نیچے پرواز کرنی شروع کر دی تب اچانک مجھے ایک جہاز نظر آیا۔ میں نے اپنے جسم کی پوری طاقت گویا اپنے پروں میں سمیٹ کر تیزی سے اس جہاز کی سمت پرواز شروع کر دی اور جلد ہی میں جہاز تک جا پہنچا۔ میں نے ایک پُر سکون جگہ منتخب کی اور وہاں بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے والدین کی نصیحتیں یاد آ رہی تھیں کہ بیٹا کبھی کسی ایسی چیز پر قیام نہ کرنا جو حرکت کر سکتی ہو، کیونکہ اس سے تمہیں نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ میں نے غلطی سے کوئی ایسی چیز کھالی تھی کہ جس نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ میں اپنے والدین کی نصیحت بھول گیا تھا کہ کوئی بھی ایسی چیز جو اس سے پہلے تم نے نہ کھائی ہو کبھی نہ کھانا اور پانی کبھی ایسا نہ پینا کہ جس میں سے کسی قسم کی بو آ رہی ہو، مگر اب کیا پچھتانا کہ مجھ سے یہ دونوں غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں۔ جہاز انتہائی تیز رفتار سے سمندر میں چل رہا تھا۔ مجھے پھر بھوک اور پیاس ستانے لگی، میں بہت ڈرا ہوا تھا، لیکن زندہ رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ کھانا پینا بہت ضروری تھا۔ میں جس جگہ بیٹھا تھا وہ گو کہ کافی بلندی پر تھی لیکن پھر بھی جہاز میں موجود چند لوگوں کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور



وہ میری طرف اشارے کر کے کچھ باتیں کرنے لگے جو میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہی تھیں، لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی دو برتن اٹھائے اس جگہ آیا ایک برتن میں صاف وشفاف پانی اور دُوسرے میں تھوڑا سا باجرہ چاول اور دال کے کچھ دانے تھے۔ اُس آدمی نے وہ دونوں برتن وہاں رکھے اور مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ میرا دل دانہ پانی دیکھ کر یک دم چاہا کہ لپک کر جاؤں اور کھانا پینا شروع کر دوں، لیکن مجھے والدین کی نصیحت یاد آئی کہ کسی بھی اجنبی جگہ پر اجنبی لوگوں کے ہاتھوں رکھا ہوا دانہ پانی استعمال کرنے سے پہلے اپنے چاروں طرف نظر دوڑالو کہ کہیں تمہیں پکڑنے کے لئے کوئی جال تو نہیں بچھایا جا رہا، اسی لئے میں نے بغور چاروں طرف کا جائزہ لیتا رہا، لیکن مجھے کہیں بھی اپنے لئے کسی خطرے کا دُور دُور تک کوئی احساس نہ ہوا، بہر حال میں چوکنے انداز میں نیچے آیا اور دانے کا بغور جائزہ لیا۔ یہ عام سا باجرہ تھا اور کچھ دانے چاول اور مختلف دالوں کے تھے۔ چاروں طرف کوئی بھی نہیں تھا، پہلے میں نے سکون سے ایک دو قطرے پانی کے پی کر دیکھے، پانی بالکل صاف ستھرا تھا پھر میں نے خوب مزے سے دانہ کھایا اور دوبارہ تھوڑا سا پانی پیا۔ اس طرح دو دن اور دو راتیں گزر گئیں پھر جہاز کسی بندرگاہ پر لگ گیا یہ میرے لئے اجنبی سا ملک تھا۔ جہاز کے عملے نے میرا بہت خیال رکھا اور دانے پانی کا برتن کبھی خالی نہ ہونے دیا۔

چھٹے دن وہ جہاز وہاں سے پھر روانہ ہوا اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ جہاز شاید میرے ہی ملک کی طرف جا رہا ہے اس دوران جہاز کے عملے کے لوگ مجھے آ آ کر دیکھتے رہتے تھے شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میں صحیح سلامت اپنے ملک واپس پہنچ جاؤں۔ مجھے اندازہ نہیں ہو سکا کہ جہاز نے کتنے دن سفر کیا، بس یہ ہوا کہ ایک رات مجھے اچانک ہواؤں میں اسی مانوس خوشبو کا احساس ہوا جو میرے ملک کی ہواؤں کی مخصوص مہک تھی۔ میں نے تیزی سے اُڑ کر باہر ایک تار پر بیٹھ کر چاروں طرف کا بغور جائزہ لیا تو میں خوشی سے بے حال ہو گیا، یہ میرا ہی ملک تھا۔ جہاز آہستہ آہستہ بندرگاہ کی طرف گامزن تھا اور جوں ہی جہاز لنگر انداز ہوا۔ میں اندھیرا ہونے کے باوجود اپنے ملک کی مانوس فضاؤں میں محوِ پرواز ہو گیا۔ یہاں تو میں اندازے سے اندھیرے میں بھی پرواز کر سکتا تھا اور پھر میں جلد ہی اپنے گھونسلے تک پہنچ گیا، گھونسلہ جوں کا توں محفوظ تھا۔

اُس رات میں سکون سے اپنے گھونسلے میں سویا۔ صبح جب میں جاگا تو اپنے آپ کو بہت تر و تازہ اور چاق چوبند محسوس کر رہا تھا۔ میں نے گھونسلے سے اُڑان بھری اور تھوڑے فاصلے پر واقع ایک اسکول کے پارک میں جا کر دانہ دنکا چگا اور پھر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس جہاز پر جا کر تھوڑا وقت گزاروں، جلد ہی میں اس جہاز تک پہنچ گیا۔ میرے لئے کھانے اور پینے کے برتن وہیں رکھے ہوئے تھے، میں نے تھوڑا سا دانہ کھایا اور پھر اس برتن کی تلاش شروع کر دی جس میں موجود پانی کو پی کر میں بے ہوش ہو گیا تھا، جلد ہی مجھے وہ برتن مل گیا۔ اس میں سے آج بھی ویسی ہی بو آرہی تھی، میں نے اس کا بغور جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ وہ کوئی ایسا کیمیکل تھا جس سے جہاز پر لگے گریس اور تیل کے داغوں کو صاف کیا جاتا ہے، میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کیمیکل کو پینے سے مجھے زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ وہ جہاز وہاں ایک ہفتے لنگر انداز رہنے کے بعد روانہ ہو گیا۔

میں اب بھی بندرگاہ پر موجود جہازوں پر جاتا ہوں، اکثر ان جہازوں پر بنے کیبنوں پر بیٹھتا بھی ہوں، لیکن کچھ کھاتا نہیں ہوں کیوں کہ ایسا کرنا کبھی کبھی سخت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

پھر دن گزرتے گئے اور اب میرے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، جن کو میں آج کل اُڑنا سکھا رہا ہوں۔ وہ نصیحتیں جو میرے والدین مجھے کرتے تھے وہ ہی نصیحتیں میں اپنے بچوں کو کرتا ہوں تاکہ وہ بھی بھرپور اور اچھی زندگی گزار سکیں۔

---☆☆---



ڈاکٹر طارق ریاض خان (لاہور)

تتلی

پھولوں اور بہار کی بات تتلی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اِدھر پھولوں نے بہار کو مہکایا، اُدھر ہی تتلی آ پہنچی۔ تتلی کا تعلق حشرات (INSECTS) سے ہے۔ اپنی خوب صورتی اور نزاکت کی بنیاد پر اسے (بٹر فلائی) "Butter fly" کہا جاتا ہے۔

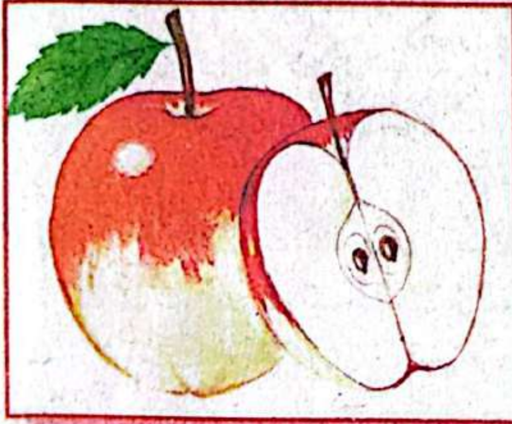
تتلیوں کی 5000 اقسام دریافت ہو چکی ہیں۔ ان کی عمر سات دن سے لے کر 365 دن تک ہو سکتی ہے۔ اس کا انحصار ان کی نوع (Spcies) پر ہے۔ ان کا دورِ حیات انڈہ



(Egg)، لاروا (Larwa)، پیوپا (Pupa) اور بالغ (Adult) پر مشتمل ہوتا ہے۔ پودوں کی افزائش نسل میں بھی یہ اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جب یہ تتلیاں باغ میں آ کر پھولوں کا میٹھا میٹھا رس چوستی ہیں تو پھولوں سے زردانے (Pollen grains) ان کے پروں پہ لگ جاتے ہیں۔ جب یہ تتلیاں دُوسرے پھولوں تک جاتی ہیں تو زردانے یعنی پولن گرینز وہاں جھاڑ دیتی ہیں۔ یوں یہ تتلیاں پودوں کے تولیدی عمل میں حصہ دار بن جاتی ہیں۔ آلودگی اور دھوئیں کی زیادتی نے تتلیوں کی کئی اقسام کو ناپید کر دیا ہے۔

سیب

دُنیا بھر میں سیب کی 1200 سے زائد اقسام موجود ہیں، جن کے رنگ سبز، سرخ، گلابی اور زرد ہوتے ہیں۔ ذائقے کے لحاظ سے اس کی کئی قسمیں ہیں۔ کچھ قسموں کے سیب کھٹے میٹھے، بعض کھٹے، بعض بہت میٹھے اور نرم اور بعض ترش و سخت ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں عنبری، گولڈن، کلو، شیرازی وغیرہ سیب دستیاب ہیں۔ پاکستان میں سیب کی پیداوار کوئٹہ اور اس کے اردگرد کے علاقے میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سیب کشمیر، مانسہرہ، گلگت، ایبٹ آباد، بالاکوٹ اور سوات وغیرہ میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ عالمی سطح پر امریکہ میں



سیب کی پیداوار سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ پھل دل، دماغ اور جگر کو طاقت دیتا ہے۔ یہ خشک کھانسی، معیادی بخار، امراضِ معدہ، ہائی بلڈ پریشر، امراضِ چشم، گردے کی پتھری، جوڑوں کے درد، دانتوں کے امراض میں بھی مفید ہے۔ سیب سے مربہ، جیلی، کینڈی یا خشک مربہ، جیم، خمیرہ، گل قند، حلوہ، جوس، شربت، سرکہ اور عرق تیار کیا جاتا ہے۔

سیب کو پھلوں میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ توانائی بخش، غذائیت سے بھرپور لذیذ پھل ہے، اس میں دیگر پھلوں اور سبزیوں سے زیادہ فاسفورس ہے جس کی وجہ سے یہ خون پیدا کرتا اور جلد کی رنگت کو نکھارتا ہے۔ مشہور ہے کہ روزانہ ایک سیب کھانے سے معالج کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ اس کے استعمال سے جسم کے تمام نظام درست رہتے ہیں۔

CS CamScanner

ببر شیر

جنگل کا بادشاہ، طاقت ودہشت، رعب ودبدبے کی علامت ببر شیر کا سائنسی نام(PANTHERA LEO) ہے۔کسی زمانے میں ببر شیر دُنیا کے متعدد جنگلات میں ملتا تھا، لیکن اب ان کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔ شمالی افریقہ، مشرق وسطٰی اور مغربی ایشیاء میں یہ تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ تاہم شمال مغربی بھارت میں



اب بھی ببر شیر ملتے ہیں۔ جہاں ان کی تعداد صرف 300 رہ گئی ہے۔ایک ببر شیر کی اوسط عمر 12 سے 14 برس تک ہوتی ہے۔ ببر شیر کا وزن 250 کلوگرام تک ہوتا ہے، جب کہ مادہ کا وزن 120 سے 185 کلوگرام تک ہو سکتا ہے۔ 1970ء میں برطانیہ کے مشہور چڑیا گھر(COLCHESTER ZOO) سمبا "SIMBA" نامی ببر شیر کا وزن 375 کلوگرام ریکارڈ کیا گیا تھا۔

سوائن فلو

ٹی وی چینلز اور اخبارات سوائن فلو کے حوالے سے عوام کو اہم ہدایات محکمہ صحت کے توسط سے پہنچا رہے ہیں۔ پیارے بچو! سوائن فلو کو سوائن انفلوائنز (Swin Influenza) یا پگ فلو (Pig Flu) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کے وائرس s/v یعنی سوائن انفلوائنز وائرس کی وجہ سے پھیلتا ہے۔ جسے H1N1 ٹائپ کہا جاتا ہے۔ 1918ء میں پہلی بار معلوم پڑا کہ سوائن فلو کا وائرس سور (Pig) میں پایا جاتا ہے۔ جو لوگ سور کا گوشت کھاتے ہیں باآسانی اس مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ مرض ایک انسان سے دُوسرے انسان تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جھوٹا پانی پینے اور ہاتھ ملانے سے بھی یہ مرض

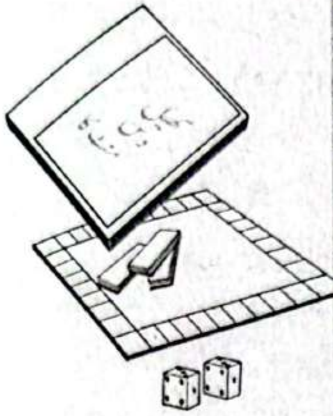


دُوسرے انسانوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں دُوسرے ممالک سے آنے والے لوگ یہ بیماری لے آئے ہیں۔ بخار، چھینکیں، بھوک کم ہونا، وزن گھٹنا، جسم ٹوٹنا اور کمزوری اس مرض کی اہم علامات ہیں۔ دسمبر 2009ء تک پاکستان میں اس کے 114 مریض ہسپتالوں میں پہنچ چکے ہیں۔

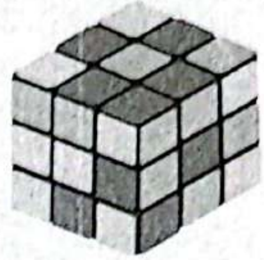
باکسنگ

آپ نے ٹیلی ویژن پر دو افراد کو ایک دُوسرے پر مکے چلاتے دیکھا ہوگا۔ ہاتھوں پہ مخصوص دستانے چڑھائے یہ لوگ باکسنگ کھیل رہے ہوتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مصر اور یونان کی قدیم تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ یہ کھیل کھیلا کرتے تھے۔ 6000 قبل مسیح بھی یہ کھیل لوگوں میں مقبول تھا۔ پہلے لوگوں ہاتھوں سے مکے مارتے تھے۔ تاہم 900 قبل مسیح دستانے استعمال کرنے شروع کیے گئے۔ باکسنگ کے ابتدائی قوانین 1743ء میں بنائے گئے تھے۔ اب اس کھیل کے 12 راؤنڈ ہوتے ہیں۔ ہر راؤنڈ 3 منٹ کا ہوتا ہے۔





کھیل دس منٹ کا



ل	د	ز	ا	ن	گ	و	ر	گ	خ
خ	ر	ب	و	ز	ہ	ت	م	ذ	و
ع	ن	م	ج	ب	ش	خ	ڈ	م	ب
ض	پ	س	ا	م	ا	ل	ٹ	ا	ا
ش	چ	ض	م	ک	م	ز	ح	ٹ	ن
م	غ	ی	ن	ف	ی	پ	ش	چ	ی
ت	ر	ب	و	ز	ق	ج	س	ن	ع
آ	م	ل	غ	ج	ا	ٹ	ی	ض	ف
ن	ا	ش	پ	ا	ت	ی	ب	خ	ظ
ط	ر	ق	د	ل	د	و	ر	م	ا

آپ نے حروف ملا کر دس پھلوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان پھلوں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں اور اُوپر سے نیچے تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن پھلوں کو آپ نے تلاش کرنا ہے ان کے نام یہ ہیں۔

آم۔ انگور۔ ناشپاتی۔ تربوز۔ مالٹا۔ امرود۔ سیب۔ خربوزہ۔ خوبانی۔ جامن

فرق تلاش کریں







یہ دونوں تصاویر بظاہر ایک جیسی لگ رہی ہیں، لیکن ان میں دس جگہ پر فرق ہے۔

کیا آپ یہ فرق تلاش کر سکتے ہیں؟



حسین صاحب نے کچھ قرض لے کر ایک چھوٹی سی کریانے کی دُکان کھولی تھی۔ وہ صبح دُکان کھولتے اور ان کا بیٹا شاہد دوپہر کے وقت اسکول سے آتا تو کھانا کھا کر دُکان پر بیٹھ جاتا پھر حسین صاحب کھانا کھانے کے لیے چلے جاتے اور ایک گھنٹہ آرام کے بعد واپس آجاتے۔ شاہد دو گھنٹے کے بعد واپس آ کر آرام کر کے کھیلتا اور مغرب کے بعد ہوم ورک کرتا۔ اس طرح اس خاندان کی زندگی کی گاڑی چلی رہی تھی۔

حسین صاحب کچھ بچت کر کے اپنا قرض ادا کر رہے تھے۔

آج شاہد دو گھنٹے کے لیے دُکان پر آیا۔ وہ گاہکوں کو سودا سلف دے کر فارغ ہوا تھا کہ ساتھ والا دُکان دار صابر آگیا۔ اُس نے آتے ہی کہا۔

"شاہد! ہزار روپے دینا میں کل دے دوں گا۔"

شاہد نے فوراً ہزار روپے اُسے دے دیئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ صابر کل ہزار روپے واپس کر دے گا۔ تھوڑی دیر بعد حسین صاحب دکان پر آئے۔ شاہد نے انہیں ہزار روپے کے متعلق بتایا تو وہ چونک اٹھے۔

"بیٹا! کیوں دیے اُسے ہزار روپے، وہ واپس نہیں کرے گا، اس کی خصلت یہی ہے۔"

شاہد خاموشی سے یہ سنتا رہا۔

دُوسرے دن جب شاہد اسکول سے واپس آیا تو وہ صابر کا انتظار کرتا رہا۔ کافی انتظار کے بعد جب وہ نہ آیا تو وہ اس کی دُکان میں چلا گیا۔

"چچا صابر! کل آپ نے پیسے لیے تھے وہ دے دیں۔"

"پتر! ابھی تو پیسے نہیں، دو دن بعد لے لینا۔" صابر نے کہا۔

یہ سن کر شاہد واپس اپنی دُکان میں آگیا۔

"کیا مل گئے پیسے؟" اُسے دُکان میں داخل ہوتے دیکھ کر حسین صاحب نے پوچھا۔

شاہد سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ ابا کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

"یہ صابر پڑھا لکھا جاہل ہے۔ یہ دُوسروں کے پیسے کھا کر بیٹھ جاتا ہے۔" حسین صاحب نے اپنا غصہ نکالا۔

کتنے ہی دن گزر گئے تھے۔ شاہد انتظار کرتا رہا، مگر صابر ایسے ہو گیا جیسے اُس نے کبھی پیسے لیے ہی نہیں تھے۔ صابر کی انڈوں کی ایک چھوٹی سی دُکان تھی۔

شاہد حسبِ معمول اپنی دُکان پر بیٹھا تھا کہ صابر دُکان میں داخل ہو۔ شاہد سمجھ رہا تھا کہ وہ پیسے واپس کرنے آیا ہے۔

"بیٹا! ایک چھالیہ کا ڈبا دینا۔"

شاہد کی توقع کے خلاف چچا صابر نے ایک اور مطالبہ کر دیا تھا۔

''چچا! پہلے ہزار روپے دیں۔'' شاہد نے ٹکا سا جواب دیا۔

صابر حیرت سے اس کا منہ تکتے ہوئے واپس چلا گیا۔ اسے شاید اس بات کا افسوس تھا کہ شاہد اس دفعہ اس کے داؤ میں نہیں آیا تھا۔ صابر کو جاتے دیکھ کر اچانک شاہد کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور اگلے روز ہی اُس نے اس پر عمل بھی کر لیا۔

''چاچا صابر! یہ لیں چھالیہ کا ڈبا، پیسے بعد میں دے دیجئے گا۔'' صابر نے بڑی حیرت سے چھالیہ کا ڈبا پکڑا۔ وہ سوچنے لگا۔

''چلو یہ بھی ہضم کر لوں گا۔'' چھالیہ کے شوقین صابر نے خوشی خوشی ڈبا کھولا تو اُسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

''ہائیں یہ کیا!'' چھالیہ کے ڈبے میں چھالیہ کے ساتھ ایک کاغذ بھی تھا۔

اس نے تجسس سے وہ کاغذ کھولا اور پھر اس کی نظریں تیزی سے تحریر پر دوڑنے لگیں۔

''مجھے ایک ہزار درہم کی اشد ضرورت ہے۔ اے بھائی! کچھ قرض دے دو۔''

بنی اسرائیل کی قوم میں ایک شخص نے دُوسرے سے قرض مانگا۔

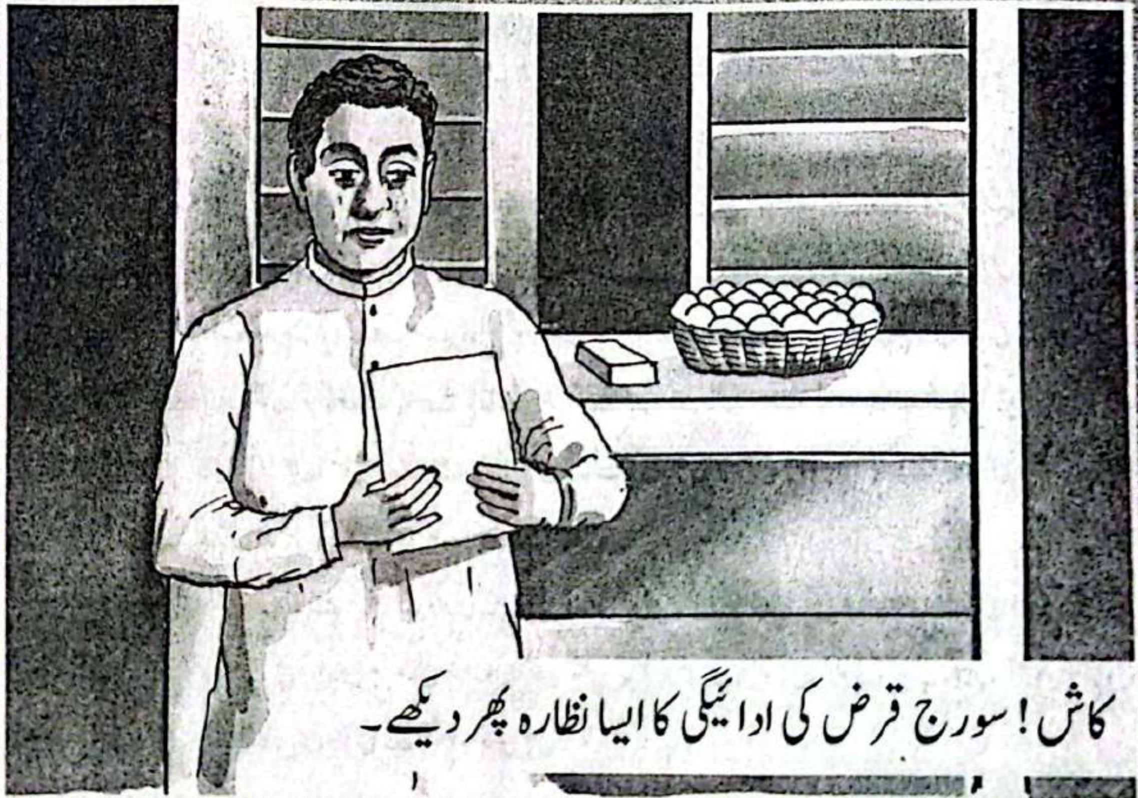
''تمہارے پاس کوئی گواہ ہے تاکہ کل تم قرض کا انکار نہ کر دو کہ میں نے کوئی قرض نہیں لیا۔''

قرض لینے والے نے کہا۔

''نہیں میرے پاس کوئی گواہ نہیں، بس اللہ کے لیے تم قرض دے دو۔ میں قرض تمہیں لوٹا دوں گا۔''

چنانچہ اس شخص نے قرض خواہ کو ایک ہزار درہم قرض دے دیے اور مدت مقرر کر لی کہ اس تاریخ کو وہ قرض لوٹا دے گا۔

قرض خواہ تجارت کی غرض سے دُوسرے شہر چلا گیا۔ وہ شہر دریا کے پار تھا۔ قرض لوٹانے کے وقت اُسے کوئی کشتی نہ مل سکی جس سے وہ وقتِ مقررہ پر جا کر قرض واپس کر سکتا۔ اب وہ پریشان ہو گیا کہ وقتِ مقررہ پر قرض واپس کرنا


کاش! سورج قرض کی ادائیگی کا ایسا نظارہ پھر دیکھے۔

ضروری ہے اور کوئی کشتی بھی نہیں مل رہی۔ اُس نے اللہ سے مدد مانگی۔ اُس کی نیت صاف تھی۔ اُس نے لکڑی کا ایک تنا لیا اور اسے کھود کر اس میں ایک ہزار درہم ڈالے اور ایک خط لکھ کہ اُسے اچھی طرح سے باندھ کر دریا کے حوالے کر دیا اور اللہ سے دُعا کی۔

"یا اللہ میں نے اپنے حصے کا کام کر دیا ہے۔"

جس شخص نے قرض دیا تھا وہ وقتِ مقررہ پر اُس جگہ پہنچا۔ جس جگہ اُسے قرض واپس لینا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ شخص کسی کام سے دریا کے پار گیا ہے، مگر اس وقت کوئی کشتی نہ آئی تو وہ انتظار کرنے لگا۔

کشتی نہ آنی تھی اور نہ آئی۔ وہ مایوس ہو کر واپس جانے لگا تو اُسے وہ تنا نظر آیا۔

اُس نے اِس خیال سے لکڑی کا تنا اُٹھا لیا کہ چلو یہ جلانے کے کام آئے گا۔ جیسے ہی اُس نے گھر جا کر لکڑی کا تنا چیرا تو وہ حیران رہ گیا۔ لکڑی کے تنے سے ایک ہزار درہم اور اس کے نام ایک خط نکلا، وہ بروقت قرض کی ادائیگی پر حیران ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد وہ شخص واپس آیا اور ساتھ ایک ہزار درہم لایا تو اس شخص نے لینے سے انکار کر دیا کہ مجھے میرا اصل حق مل چکا ہے۔

یہ سارا واقعہ لکھنے کے بعد آگے لکھا تھا۔

"کاش! سورج قرض کی ادائیگی کا ایسا نظارہ پھر دیکھے۔"

آخری جملہ پڑھتے ہی صابر کا دل لرز گیا۔ میں کس قدر غلط ہوں۔

اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ ایک عزم سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

شاہد کی تدبیر کارگر ہو چکی تھی اور اُسے اُسی وقت ہزار درہم کی طرح ہزار روپے واپس مل چکے تھے۔

---☆☆---

پھلوں کی وادی

پھلوں کی وادی کوئٹہ دُنیا بھر میں مشہور ہے یہاں ہر موسم میں پھل ملتے ہیں جو ذائقے اور لذت میں اپنی مثال آپ ہیں اور خشک میوہ یہاں کی خاص سوغات ہے، جس میں پستہ، بادام چلغوزے اور اخروٹ شامل ہیں۔

کوئٹہ انگوروں کا گھر ہے۔ انگوروں کی یوں تو بہت سی قسمیں ہیں، لیکن صاحبی اور سندر خانی انگور خاص طور پر مشہور ہیں، صاحبی انگور تو اتنا نازک ہوتا ہے کہ یہ کوئٹہ سے باہر کم ہی بھیجا جاتا ہے۔ اس کا رنگ عموماً گلابی ہوتا ہے اور اس کے گچھوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ کسی نے گلدستہ بنا دیا ہے۔ سندر خانی انگور بہت خوش ذائقہ ہوتا ہے اور یہ انگلی کی پور کی طرح لمبا ہوتا ہے۔

کوئٹہ شہر سے باہر نکلیں تو چھوٹے چھوٹے باغات نظر آتے ہیں جن میں سیب، آڑو، بادام، خوبانی، چیری، اور انگور کے باغات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، موسمِ بہار کے دوران ان باغات میں پھل دار اور پھول دار پودے بہت ہی دل کش منظر پیش کرتے ہیں جس سے قدرتی مناظر اور بھی نکھر کر سامنے آتے ہیں۔

کوئٹہ سے چند میل کے فاصلے پر اڑک وادی ہے، اس وادی کو کوئٹہ کا ثمرستان بھی کہا جاتا ہے۔ اِس وادی میں ہر طرف پھلوں کے باغات نظر آتے ہیں جہاں ہر سال ہزاروں من پھل پیدا ہوتا ہے۔ خوبانی، آلوچہ، سیب، انار، آڑو، ناشپاتی، بادام، اخروٹ، پستہ، خربوزہ اور تربوز اس وادی کے مشہور پھل ہیں۔

(محمد سیف اللہ، سرگودھا)



کاگوڑا

سارہ شیخ (کراچی)

لطیف چودھری اپنے خوب صورت ڈرائنگ روم میں ایک قیمتی صوفے پر براجمان تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک بھیانک مسکراہٹ تھی اور آنکھوں سے بربریت عیاں تھی۔ اُس کے سامنے تین آدمی ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ حلیے سے وہ بھی بدمعاش معلوم ہو رہے تھے۔ لطیف چودھری نے اپنے برابر میں رکھی تپائی سے ایک سیاہ رنگ کا بریف کیس اٹھایا اور اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"سنبھلنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ تین دن کے اندر اندر مجھے میڈیا کے ذریعے خوشخبری مل جائے۔ اب جاؤ، کاگوڑا!"

تینوں آدمیوں نے سیلوٹ کے انداز میں سلام کرتے ہوئے بیک وقت کہا۔

"کاگوڑا!" اور باہر نکل گئے۔ لطیف چودھری آنکھیں بند کرتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر ابھی تک وہی بھیانک مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

☆☆

"آؤ بھئی کامران آؤ! تم تو عید کا چاند ہی ہو گئے ہو۔"

"کیا بتاؤں انسپکٹر صاحب! کچھ مہمان ٹھہرے ہوئے تھے، اس لیے فرصت نہیں ملی۔ ورنہ کافی دن پہلے ہی چکر لگاتا۔" میں نے بیٹھتے ہوئے انسپکٹر رضی کے شکوے کا جواب دیا۔

کچھ رسمی باتوں کے بعد اور چائے پینے کے دوران میں نے پوچھا۔

"آج کل ملک میں بم دھماکوں کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں۔ خصوصاً ملٹری فورس کے اداروں پر تواتر کے ساتھ حملے ہو رہے ہیں۔ کیا اِن کی روک تھام کے لئے کچھ نہیں کیا جا رہا؟"

انسپکٹر رضی یک دم سنجیدہ ہو گئے اور کچھ سوچنے لگے۔ وہ کچھ دیر بعد بولے۔

"کیوں نہیں کیا جا رہا! خفیہ ادارے، پولیس فورس، سب مل کر ان حملوں کا سدِ باب کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، مگر کوششوں کے باوجود بھی پتہ نہیں چل سکا کہ اصل میں یہ حملے کون کروا رہا ہے۔ نہیں، مجھے بولنے دو۔" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا کیونکہ میں اُن کی بات کاٹنے والا تھا۔ "مختلف فرقوں پر الزام لگانا آسان ہے۔ اسی بات کا فائدہ کچھ ایسے عناصر اٹھا رہے ہیں، جو بہت طاقت ور ہیں اور اُن کا مقصد صرف ہمارے ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔ اِن لوگوں نے اپنا جال دُور دُور تک پھیلا رکھا ہے اور ان کا کام اتنا منظم ہے کہ اگر ہم کسی آدمی کا کھوج لگا بھی لیتے ہیں تو بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اصل میں ہدایات دینے والا کون ہے۔ وہ جن جگہوں کا پتہ بتاتے ہیں وہ خالی ہوتی

ہیں۔"

"آپ نے کچھ اندازہ تو لگایا ہو گا؟" میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

"ہاں کچھ اندازے تو ہیں، مگر صرف اندازے، انہیں پکڑنے کے لئے ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ ایک تو یہ کہ اصل بازی گر ایک یا ایک سے زیادہ بااثر شخصیات ہیں۔ باقی سب کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں، جن کی ہر حرکت کا انحصار ڈور ہلانے والے پر ہے۔ دُوسری بات یہ کہ ہمیں کچھ شواہد ملے ہیں جن سے اندازہ ہوا ہے کہ یہ لوگ پاکستان سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ کہیں اور کے ہیں۔ کہاں کے ہیں، یہ ہمیں نہیں معلوم۔"

گھر آکر بھی میرا ذہن انہی باتوں میں الجھا رہا۔ اگر اس خرابے کے کرتا دھرتا افراد کا سراغ نہ ملا تو اُن کے حوصلے بڑھ جائیں گے، وہ اور زیادہ دیدہ دلیری سے حملہ کریں گے۔ اسی دوران میرا موبائل فون بجنے لگا۔ میں نے جلدی سے فون کان سے لگایا تو آواز آئی۔

"یار کامران! کدھر ہو؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"اف، مجھے یاد ہی نہ رہا۔ بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں جلدی جلدی تیار ہوا اور گھر سے نکل پڑا۔

ایک خوب صورت بنگلے کے پاس پہنچ کر میں نے گھنٹی بجائی تو فوراً دروازہ کھل گیا۔

"اور سناؤ اعجاز! کیا حال ہیں تمہارے؟ معاف کرنا تھوڑی دیر ہو گئی۔" میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ میرے دوست نے مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا اور اندر لے جاتے ہوئے کہنے لگا۔

"اب اگر ہم معافی تلافی میں لگ گئے تو مزید دیر ہو جائے گی۔ اور رہی بات میرے حال کی تو وہ تو اب ٹھیک ہو ہی گیا ہے۔"

اعجاز، لطیف چودھری کا اکلوتا بیٹا میرا دوست تھا۔ آج اُس نے مجھے اپنی نئی کوٹھی دکھانے کے لیے بلایا تھا۔

ہم اسی طرح باتیں کرتے ہوئے اُس کے کمرے تک پہنچ گئے۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا اور خود باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد برابر والے کمرے سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کمرے سے باہر نکلا اور برابر کے کمرے میں جھانکا۔ اعجاز کے ابو کسی سے وائرلیس پر پُر جوش لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔

"شاباش سلیم شاباش! آج ہر طرف اسی خبر کا چرچا ہے۔ تم نے بڑا کام کیا۔ کاگوڈا تم سے بہت خوش ہیں۔"

اچانک لطیف خاموش ہو گئے اور مڑ کر دیکھنے لگے۔ میں تیزی سے پیچھے ہو گیا اور دوڑ کر اعجاز کے کمرے میں گھس کر کرسی پر بیٹھ گیا اور قریب پڑا رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اسی لمحے لطیف صاحب اندر داخل ہوئے۔ میں انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سلام کیا۔ وہ جواب دینے کے بجائے مجھے گھورتے ہوئے بولے۔

"تم کب سے یہاں بیٹھے ہو لڑکے؟ مجھے تمہارے آنے کی اطلاع تو نہیں ملی۔"

میں نے جلدی سے کہا: "انکل! میں تو تھوڑی دیر پہلے آیا ہوں۔ اعجاز مجھے بٹھا کر کسی کام سے گیا ہوا ہے۔ میں یہ رسالہ دیکھ رہا تھا، آپ کیسے ہیں؟"

میرا جواب سن کر لطیف صاحب کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ وہیں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں اعجاز آ گیا۔ اپنے والد کو وہاں بیٹھے دیکھ کر وہ بولا۔

"ابو! آپ آج یہاں کیسے؟ آپ کو کیسے پتا چلا کہ کامران آیا ہے؟ میں نے تو آپ کو نہیں بتایا تھا؟" اس سے پہلے کہ لطیف صاحب کچھ کہتے، وہ پھر بولا: "میں کامران کو پورا گھر دکھانا چاہتا ہوں ابو!" لطیف صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ کچھ سوچ کر بولے۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے اور ہم لطیف صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

اعجاز تو کمرے پر تبصرہ کر رہا تھا، مگر میرا دماغ کچھ اور ہی

سوچ رہا تھا۔ لطیف صاحب کس سے باتیں کر رہے تھے؟ کاگوڈا کون ہے؟ بڑا عجیب سا نام ہے۔ کس خبر کا چرچا ہر طرف ہے؟ آخر بات کیا ہے؟ مجھے تجسس ہونے لگا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ لطیف صاحب اب کس سے بات کریں گے؟ آخر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اعجاز تو بولتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا، میں نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا اور ریکارڈنگ کا بٹن دبا کر لطیف صاحب کی میز کے قریب زمین پر رکھ دیا۔ اس کام میں بامشکل پانچ سیکنڈ لگے ہوں گے۔ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے آواز دی۔

"چلو اعجاز! تمہارے ابو کا حرج ہو گا۔ دُوسرے کمرے دیکھتے ہیں۔"

اعجاز منہ بنا کر میرے ساتھ باہر نکل آیا۔

"پتہ نہیں ابو اتنا کام کیوں کرتے ہیں؟"

ہم تمام کمروں میں گھومتے رہے۔ پورا بنگلہ بہت شان دار تھا۔

ہم کچھ دیر تک مختلف کمرے دیکھتے رہے۔ پھر میں نے اعجاز کو موبائل فون کے گم ہونے کا بتایا تو اعجاز بولا اگر تم موبائل اپنے ساتھ لائے تھے تو وہ یہیں کہیں ہو گا۔ لطیف صاحب کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اعجاز کے دستک دینے پر وہ منہ بنائے باہر نکلے۔ اعجاز نے ساری بات بتا کر کمرہ دیکھنے کی اجازت مانگی۔ ہم اندر داخل ہوئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اچانک اعجاز نے چیخ ماری۔

"کامران موبائل مل گیا!"

"کہاں ہے؟"

"یہ میز کے پاس گرا ہوا تھا۔" پھر ہم دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

☆☆

میں گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ سب لوگ ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔

"کیا ہوا ابو؟"

"خبر آئی ہے کہ پولیس ٹریننگ کیمپ پر پھر حملہ ہوا ہے۔ کئی نوجوان شہید ہوئے ہیں۔"

یہ سن کر میرے دماغ میں دھماکا ہوا۔

"آج ہر طرف اُسی خبر کا چرچا ہے۔ کاگوڈا تم سے بہت خوش ہیں......" لطیف چودھری کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں دوڑ کر اپنے کمرے میں گیا اور ریکارڈ کیا ہوا مواد سننے لگا۔

"ہاں جیراڈ، میں بات کر رہا ہوں۔ کل رات دس بجے پلی پر۔ گو کا خاص طور پر کہنا ہے کہ کوئی کوتاہی نہ ہونے پائے۔ اس ملک کی جتنی بدنامی ہو، اتنا ہی وہ خوش ہوں گے۔ آج کے دھماکے سے وہ بہت خوش ہیں۔ تم کام کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ میری طرف آجانا۔ تم سے پھر ملاقات ہو گی۔ کاگوڈا! بائے۔"

یہاں آ کر ریکارڈنگ ختم ہو گئی۔ میں اپنی جگہ پر جیسے جم گیا تھا۔ کوئی اور دھماکہ، مزید لاشیں، مزید خون، چیخ وپکار، پریشانی، ڈر اور خوف وہراس...... میں نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں؟ میرے پاس کیا معلومات ہیں؟ کیا طاقت ہے؟ "نہیں میں بے بس نہیں ہوں۔ میرے پاس دماغ ہے۔ مجھے اُس کا استعمال کرنا چاہیے۔"

میں نے تکیے پر مکا مارا۔ اب میں نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ میرے پاس ایک ریکارڈ شدہ گفتگو تھی اور ایک وہ جو میں نے خود سنی تھی۔ دونوں میں ایک بات عجیب تھی۔ کاگوڈا! یہ کیا ہے؟ یہ تو شاید کسی آدمی کا خفیہ نام ہے، کیوں کہ لطیف چودھری نے پہلی گفتگو کے دوران کاگوڈا کے خوش ہونے کا ذکر کیا تھا، مگر دُوسری دفعہ تو آخر میں شاید کوڈ ورڈ کے طور پر کاگوڈا کہا گیا تھا۔ میں نے نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ کاگوڈا جو کوئی بھی ہے، اُس کا وجود اتنا اہم ہے کہ اُس کا نام کوڈ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، یقیناً یہی اِس تنظیم کا کرتا دھرتا ہے اور لطیف



چودھری جیسے لوگ کٹھ پتلیاں ہیں۔

میں نے دوبارہ ریکارڈنگ سنی۔

"کل رات دس بجے پل پر...... کون سے پل پر؟ کون سی جگہ؟" میرا دماغ سنسنا اُٹھا۔

"اِس ملک کی جتنی بدنامی ہو، اتنا ہی وہ خوش ہوں گے۔" بدنامی کس طرح ہو گی؟ کسی بین الاقوامی نقصان پر؟ پل پر کیا بین الاقوامی نقصان ہو سکتا ہے؟ پلوں پر سے تو گاڑیاں گزرتی ہیں۔ تو کیا کوئی گاڑی۔" میں یہ سوچ کر ڈرائنگ روم کی طرف دوڑا۔ ابو ابھی تک خبریں سن رہے تھے۔ میں بھی بیٹھ گیا۔

ٹی وی پر سلائیڈ چل رہی تھی۔

"کل شام سات بجے کی فلائٹ سے چینی سفیر گورنر صاحب سے ملاقات کے لیے آ رہے ہیں......"

میری آنکھوں کے آگے بجلیاں چمکنے لگیں۔ چینی سفیر کی آمد۔

"ابو! کیا ائیرپورٹ سے گورنر ہاؤس جاتے ہوئے راستے میں کوئی پل بھی آتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔ ابو نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

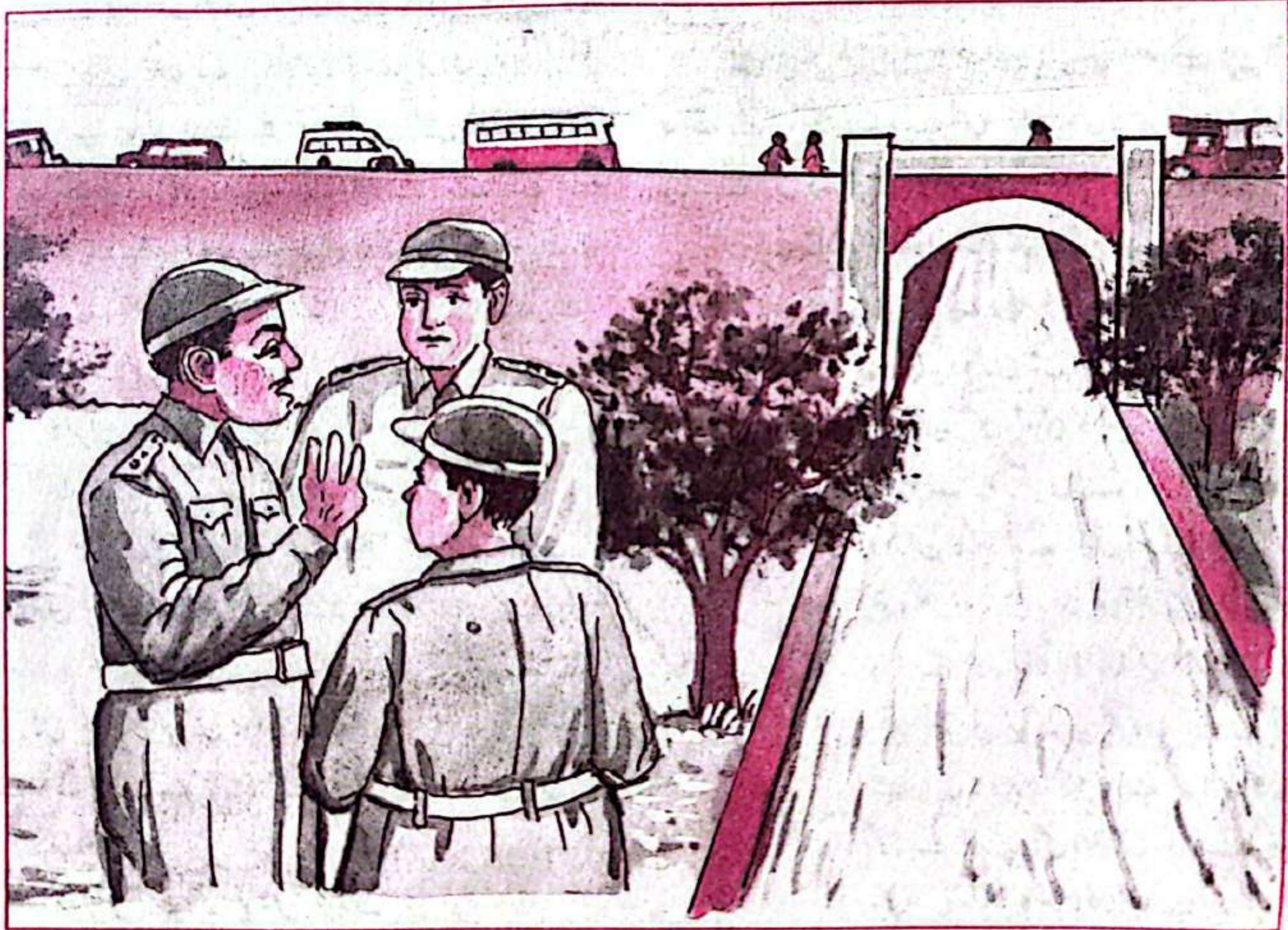
"ہاں، آتا تو ہے، مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس ابو! ویسے ہی!" میں نے نظر ٹی وی پر جمائے رکھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ انسپکٹر رضی کو فون کر کے ساری بات بتا دوں، مگر میں تمام لوگوں، خصوصاً مسٹر کاگوڈا، کو بھی ساتھ ہی پکڑوانا چاہتا تھا، مگر دُوسری طرف میرے پاس وقت کی کمی بھی تھی۔ "بارہ بجے تک اگر پتہ نہ چلا تو انسپکٹر صاحب کو بتا دوں گا۔" میں نے تہیہ کر لیا۔

نیوز ریڈر کی آواز آئی۔

"تھری اسٹار کمپنی کے مالکان اعظم کاوش، کاشف گوندل اور عرشی دانیال کل اپنی کمپنی کی نئی شاخ کا افتتاح کریں گے......" میں اُٹھ کر کمرے میں جانے کے لئے مڑا تھا کہ ابو نے پوچھا۔

"لطیف چودھری کا بیٹا تمہارا دوست ہے۔" میں تیزی



سے گھوم گیا۔

"جی ابو! آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ آج کل ان تینوں سے کامران کے ابو کی کافی دوستی ہے۔ لطیف چودھری نے اِن تینوں کو کل رات عشائیے پر بلایا ہے۔" ابو نے کہا۔ میرے ذہن میں گھنٹیاں بج اُٹھیں۔

"کل رات دس بجے......" میں نے زیر لب دہرایا اور تیزی سے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں جا کر میں نے کاغذ قلم نکالا اور اُس پر لکھا: "اعظم کاوش، کاشف گوندل، عرشی دانیال۔" کافی دیر میں کاغذ پر نظریں جمائے جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ آخر میں نے آہستہ آہستہ لکھا: کاوش، گوندل، دانیال۔" اور جیسے مجھے کرنٹ لگ گیا! "کاگوڈا، کوئی ایک شخص نہیں تھا۔ وہ تین لوگ تھے! "گوکا خاص طور پر کہنا ہے......" مجھے یاد آگیا کہ لطیف چودھری کی گفت گو میں یہ جملہ بھی آیا تھا۔ میرا ذہن روشنی کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ کاوش، گوندل، دانیال...... کا، گو، دا...... نہیں، ڈا...... کاگوڈا! "کاگوڈا! لطیف چودھری! کل رات دس بجے پل پر!" میں نے زور سے دہرایا۔

اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ مجرموں پر ہاتھ ڈالنا پولیس اور جاسوسوں کے لیے کیوں ناممکن تھا۔ کیوں کہ اُن کا اثر ورسوخ بہت زیادہ تھا۔

میں نے ریسیور اُٹھایا اور انسپکٹر رضی کا نمبر ملانے لگا۔

☆☆

اگلی صبح ہم سب ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ ابو نے اخبار کھولا اور کہنے لگے۔

"یہ دیکھو کیا لکھا ہے! کل رات ائیر پورٹ سے گورنر ہاؤس جانے والے راستے میں موجود پل پر چینی سفیر کی گاڑی کو بم سے اُڑانے کی کوشش ناکام بنا دی گئی۔ پولیس کے ایک فرض شناس انسپکٹر رضی طارق کی زیر نگرانی یہ آپریشن کیا گیا۔ بعد میں انہی کے اشارے پر لطیف چودھری اور تھری اسٹار کمپنی کے مالکان اعظم کاوش، کاشف گوندل اور عرش دانیال کو گرفتار کر لیا گیا۔ شواہد ہیں کہ حملہ انہی کے اشارے پر کروایا جا رہا تھا۔ مزید تفتیش پر پتہ چلا کہ یہ تینوں آدمی پاکستان سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ لطیف چودھری کی مدد سے اِس ملک میں آئے تھے۔ تحقیقات جاری ہیں۔"

---☆☆---

اللہ کی تلوار

خالد بن ولیدؓ جب آخری عمر کو پہنچے تو بستر سے لگ کر رہ گئے۔ ایک دن ایک صحابی عیادت کے لئے ان کے گھر تشریف لے کر گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ خالد بن ولیدؓ خاموش بیٹھے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ صحابیؓ نے دریافت کیا۔

"آپؓ تو بہت بہادر ہیں اور آپؓ کی آنکھوں میں آنسو!" خالد بن ولیدؓ نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا: "میری تمام عمر میدانِ جنگ میں گزری مجھے ہر جنگ میں فتح نصیب ہوئی۔ میری ہمیشہ شہادت کی خواہش رہی، لیکن میری بد قسمتی سے مجھے شہادت نصیب نہ ہوئی اور آج میں میدانِ جنگ کے بجائے بستر پر مر رہا ہوں۔"

آپؓ کی بات سن کر صحابی نے کہا: "آپؓ کو سیف اللہ یعنی اللہ کی تلوار کہا جاتا ہے۔ آپؓ کو شہادت نصیب ہو ہی نہیں سکتی، کیوں کہ اگر آپؓ شہید ہو جاتے تو کافر کہتے کہ آج ہم نے اللہ کی تلوار کو توڑ دیا ہے۔ وہ بلند وبرتر ذات یہ کیسے گوارا کرتی کہ اس کی تلوار میدانِ جنگ میں ٹوٹ جائے۔"

(نیہا نواز، بنوں کینٹ)



مدیر تعلیم وتربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

ہمارے والد صاحب عظیم الرحمٰن صدیقی اپنے بچپن میں تعلیم وتربیت بہت شوق سے پڑھتے تھے اوراب ہم تینوں بھائی بہنوں کو انہوں نے تعلیم وتربیت سے متعارف کرایا ہے، جو اب ہماری زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ تعلیم وتربیت رنگین ہے، حسین ہے اور معلومات سے مزین ہے۔ (زینب عظیم، شنذرے عظیم، لاہور)

کہانیوں میں ہاشی، دردِ دل، چور، کوٹھی نمبر206اور چکرپہ چکر بہت اچھی تھیں۔ (سمیعہ فیصل، بہاول پور)

مارچ کا رسالہ 27 فروری کو مل گیا تھا۔ تمام کہانیاں عمدہ اور اپنی مثال آپ تھیں۔ میں چچا تیز گام کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار بیٹھی ہوں۔ (رُطابہ تنویر، ایبٹ آباد)

کہانیاں میں چور، دردِ دل، خونی شیر اور چکرپہ چکر بہت اچھی تھیں۔ انکل! بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بہت اچھا تھا۔ اِس کے علاوہ درسِ قرآن وحدیث بھی لاجواب تھا۔

(محمد جعفر، آصف رضا، گروٹ)

اس بار لاڈی، ہاشی، چکر پہ چکر، دردِ دل اور کوٹھی نمبر 206پسند آئیں۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیااور مفید مشغلے زبردست سلسلے ہیں۔

(محمد ضیغم سردار، ملتان)

رسالے میں تبدیلیاں پسند آئیں۔ خصوصاً بچوں کا انسائیکلو پیڈیا کا سلسلہ نہایت مفید ہے اس میں ہمارے لئے بہت سی معلومات ہوتی ہیں۔ چچا تیز گام کاانتظار ہے۔

(ذیشان احمد صدیقی، کندیاں)

مارچ کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ کہانیاں لاڈی، چکر پہ چکر، کوٹھی نمبر206اور چور اچھی لگیں۔ او جھل خاکے اور کھوج لگایئے کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ (اسماء ارشاد، حسن ارشاد، گجرات)

تعلیم وتربیت یکم مارچ کو جلوہ افروز ہوا۔ آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح پسند آیا۔ چور ایک عمدہ کہانی تھی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا بے شک علی اکمل تصور بچوں کی احسن طریقے سے تربیت کر رہے ہیں۔ (محمد تنویر انگراء، پیلو وینس)

مارچ کے رسالے کا سرورق دیکھتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ ماشاء اللہ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ "آؤ مسکرائیں" میں اپنا لطیفہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ چچا تیز گام کی آمد کی خبر سن کر خوشی ہوئی۔ (ماریہ بنت طارق، راول پنڈی)

"تعلیم وتربیت" تمام تر رعنائیوں کو سمیٹے موصول ہوا۔ اداریہ حسبِ معمول شان دار تھا۔ "یومِ پاکستان" کے حوالے سے نظم بہت پسند آئی۔ کہانیوں میں کوٹھی نمبر206، لاڈی اور چور زبردست تھیں۔ (محمد آصف ریاض، جھنگ)

سرورق پر کھلاڑی ہاکی کھیلتے ہوئے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اگر اپریل 2010ء کے مہینے میں میری کہانی جو میں نے اپریل فول کے حوالے سے بھیجی ہے، سلسلہ "آپ بھی لکھئے" میں شائع نہ ہوئی تو یہ میرا آخری خط ہو گا اور میں تعلیم وتربیت پڑھنا چھوڑ دوں گا۔ (سید منظر بلال حسین، سمندری)

☆ساتھیو! آپ اس خط کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

کہانیوں میں چور، لاڈی، چکرپہ چکر اور ہاشی بہت پسند آئیں۔ مفید مشغلے اچھا سلسلہ ہے۔ (محمد اکبر جاوید، ڈیرہ غازی خان)

میں تین سال سے تعلیم و تربیت کی قاریہ ہوں۔ میرے 28 مارچ سے بورڈ کے امتحان شروع ہو رہے ہیں۔ میری کامیابی کے لیے ضرور دُعا کریں۔ میں تعلیم و تربیت سے بہت پیار کرتی ہوں۔ سلسلہ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بہت پسند آیا۔ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔
(عروج احسان، کوہاٹ)

☆ہم آپ کے لئے دُعاگو ہیں، یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

انکل! کیا آپ اسکول، کالج وغیرہ پر لکھی گئی نظمیں یا تحریریں شائع کرتے ہیں؟ (نادیہ یاسمین، کراچی)

☆تحریر معیاری ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔

اس بار ہاشی، کوٹھی نمبر 206 اور دردِ دل بہت اچھی تحریریں تھیں۔ (نمرہ شاہین، ہڈالی)

مارچ کا چمکتا دمکتا تعلیم و تربیت اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ تمام تحریریں قابلِ ستائش ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ تعلیم و تربیت کا خاص شمارہ جلد از جلد شائع کریں۔ اس کا بے چینی سے انتظار ہے۔ (تاشف احمد، لاہور)

میں تعلیم و تربیت کی پرانی قاریہ ہوں۔ جب میں چوتھی جماعت میں تھی تو پہلی بار اسے پڑھا تھا اور اب میں نہم جماعت کے بورڈ کے امتحان کی تیاری کر رہی ہوں۔ تعلیم و تربیت سے مجھے اتنی محبت ہے کہ میں کبھی اس سے تعلق ختم نہیں کروں گی۔
(فریحہ اشرف، کراچی)

مجھے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا بے انتہا شوق ہے۔ تعلیم و تربیت کی وجہ سے مجھے بہتر سے بہتر لکھنے میں مدد ملی ہے۔ میں دو کہانیاں بھیج رہی ہوں۔ (ماریہ محمود، سرگودھا)

تعلیم و تربیت ایک عمدہ اور دل چسپ میگزین ہے۔ مارچ کا شمارہ بہت خوب تھا، خاص طور پر چور، درسِ قرآن وحدیث اور نظمیں چیونٹی اور یومِ پاکستان شان دار تھیں۔ (ماہین آصف، اسلام آباد)

مارچ کا شمارہ بہت خوب صورت تھا۔ کہانیوں میں چور، دردِ دل کوٹھی نمبر 206 اور لاڈی بہت دل چسپ تھیں۔
(عمیر جاوید، لاہور)

اس بار کہانی خونی شیر بہت پسند آئی۔ (حبیبہ اسلم، مریدکے)

مارچ کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح درسِ قرآن وحدیث لاجواب تھا۔ کہانیوں میں چور اور لاڈی بہترین تھیں۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔
(سعیلہ مہتاب، میاں والی)

تعلیم و تربیت ملا جسے ہم نے حسبِ معمول پہلی ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ شمارہ بہت زبردست تھا۔ یوں تو ساری کہانیاں اچھی تھیں لیکن ہمیں لاڈی اور چکر پہ چکر بہت زیادہ پسند آئیں۔ اس کے علاوہ سرورق بھی اچھا لگا۔ (حافظ عبدالرحمٰن طارق، لاہور)

ہمیں عالمی ہاکی کپ کی معلومات تو اچھی لگیں لیکن پاکستان کی کارکردگی نے دل بے چین کر دیا۔ (سید فرخ محمود، راول پنڈی)

چور اور دردِ دل بہت سبق آموز کہانیاں تھیں۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بہت ہی معلوماتی سلسلہ ہے۔ (عمارہ حسن، راول پنڈی)

کیا ہم بھی کسی شہر کے حوالے سے مضمون معہ تصاویر بھیج سکتے ہیں؟ (سلمٰی صفی، ٹمن)

☆بھیج سکتے ہیں۔

تعلیم و تربیت پڑھا، بہت اچھا لگا۔ تمام کہانیاں عمدہ تھیں۔
(حفصہ کوثر، میاں چنوں)

تعلیم و تربیت کا تازہ شمارہ ملتے ہی دل اس کو پڑھنے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے اور جب تک ایک ایک حرف نہ پڑھ لیا جائے چین نہیں آتا۔ میں چھ سال سے تعلیم و تربیت کی باقاعدہ قاریہ ہوں۔ مارچ کے شمارے میں ہاکی کے حوالے سے سرورق

بہت اچھا تھا۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا نمبر ون تھا۔
(وریشا احمد، راولپنڈی)

اس بار بھی رسالہ لاجواب تھا۔ تمام کہانیاں اور سلسلے اچھے تھے۔
(گوہر شوکت، گوجرانوالہ)

تعلیم وتربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اچھی کہانیاں پڑھ کر میرا دل خوش ہوتا ہے۔ مجھے آؤ مسکرائیں اور بلاعنوان سلسلے پسند ہیں۔
(رمشہ بٹ، گجرات)

تعلیم وتربیت بہت اچھا اور معلوماتی رسالہ ہے۔ "کھوج لگائیے" کا سلسلہ پھر سے شروع کریں۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بہت اچھا سلسلہ ہے۔
(عمر حیات وزیر، شمالی وزیرستان)

مارچ کا رسالہ ہمیشہ کی طرح بہت شان دار تھا۔ کہانی جنگل سے جنگل تک ہمیشہ کی طرح زبردست تھی۔ اس کے علاوہ چور، لاڈی، ہاشی اور چکر پہ چکر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔
(عروہ یونس، لاہور)

بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بہت اچھا سلسلہ ہے۔ ہاشی اور لاڈی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔
(صفورہ اصفی، کراچی)

انکل! کھیل دس منٹ کا اور جنگل سے جنگل تک بہت اچھے سلسلے ہیں۔ کہانی ہاشی بہترین تھی۔
(زہرہ جمال، کراچی)

مارچ کا شمارہ اس لحاظ سے بہترین تھا کہ اس میں کہانیوں کے ساتھ ساتھ معلومات، کھیل دس منٹ کا اور فرق تلاش کریں جیسے دل چسپ سلسلے شامل تھے۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بھی قابلِ قدر سلسلہ ہے۔ کیا اس سلسلے کو بعد میں کتابی سلسلے میں شائع کیا جائے گا۔
(صائمہ اشرف، کراچی)

☆ ابھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔

لاڈی، چکر پہ چکر، ہاشی اور خونی شیر کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ آپ بھی لکھنے میں بھی تمام کہانیاں بہترین تھیں۔
(بلال احمد، خوشاب)

مارچ کا شمارہ لاجواب تھا۔ آپ کوئٹہ شہر کے بارے میں بھی کوئی معلوماتی مضموان شائع کریں۔
(جاوید اقبال، کوئٹہ)

☆ ان شاء اللہ بہت جلد کوئٹہ کے حوالے سے کوئی مضمون شائع کیا جائے گا۔

درسِ قرآن وحدیث کا ایک ایک لفظ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہوتا ہے۔ میں ہر بار یہ مفید تحریر پڑھتا ہوں۔
(جواد احمد، کراچی)

مفید مشغلے ایک مفید سلسلہ ہے جس سے ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔
(ذیشان رضا، ساہی وال)

انکل! آپ سے ایک شکایت ہے کہ آپ ہمارے محبوب رسالے میں کوئی سلسلے وار ناول شروع نہیں کر رہے۔ آپ جلد از جلد کوئی مزے دار ناول شروع کریں۔
(رخسانہ ارم، لاہور)

☆ ان شاء اللہ بہت جلد ناول شروع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مارچ کے شمارے میں کوٹھی نمبر 206، ہاشی، چور اور لاڈی لاجواب کہانیاں تھیں۔
(فرقان خورشید، میاں چنوں)

ان بچوں کے خطوط بھی موصول ہوئے تھے جو جگہ کی کمی کے باعث شائع نہ ہو سکے۔

سید عماد الدین شاہ، اسلام آباد۔ سویرا حیات، آنسہ حیات، وقار الاسلام، ڈیرہ غازی خان۔ محمد فرخ حیات، پیرمحل۔ عزیز اللہ، افہام الحسن، اٹک۔ فاطمہ صدیقی، کندیاں۔ عفیفہ عارف، عادل محمود، لاہور۔ کائنات فاطمہ، گجرات۔ زینب ظفر، حسن ابدال۔ محمد مزمل حسین، ساہی وال۔ انس احمد ضیاء، بھلوال، سیدہ نادیہ یاسمین، کراچی۔ دانیال ناصر، کوہاٹ۔ اسامہ خان، بہاول پور۔ سارہ طارق، فیصل آباد۔

انوکھا لباس

وقار محسن (کراچی)



بادشاہ کی ساٹھویں سالگرہ کی آمد تھی۔ پورے ملک میں اعلان کر دیا گیا کہ بادشاہ کی سال گرہ پر عوام بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اپنی سال گرہ پر بادشاہ نے یہ اعلان کرایا کہ ان کے لئے ایسی شان دار پوشاک تیار کی جائے جیسی آج تک کسی نے استعمال نہ کی ہو۔ جو بھی بادشاہ کے لئے ایسی انوکھی پوشاک تیار کرے گا اسے انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔

چندو جُلاہے کے تین ذہین لڑکے تھے۔ دُوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی بادشاہ کے مظالم سے نالاں تھے۔ ان تینوں بھائیوں نے بہت راز داری سے مشورہ کیا اور بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ ان لڑکوں کو دیکھ کر بادشاہ کو یقین نہیں آیا کہ ایسے کم عمر لڑکے کوئی شان دار لباس تیار کر سکتے ہیں۔ بڑے لڑکے نے ہمت کر کے کہا۔

''حضور! آپ فکر نہ کریں ان شاء اللہ ہم آپ کے لئے ایسا لباس تیار کریں گے جو آج تک بڑے سے بڑے بادشاہ کو نصیب نہ ہوا ہو گا۔ البتہ اخراجات بہت زیادہ ہوں گے کیوں کہ کپڑا سونے کی تاروں سے تیار ہو گا اور لباس پر ہیرے جواہرات سے کام ہو گا۔''

بادشاہ نے خوش ہو کر کہا۔

''تم لوگ خرچ کی فکر نہ کرو، لیکن یاد رکھو کہ اگر لباس ہمیں پسند نہ آیا تو تم تینوں کو سولی پر لٹکا دیا جائے گا۔''

چھوٹے لڑکے نے کہا۔

''حضور! آپ فکر نہ کریں، لیکن ہماری ایک عرض سن لیں کہ یہ انوکھا لباس دیکھ کر ہر شخص عش عش کر اٹھے گا لیکن جھوٹے، بے ایمان اور فریبی شخص کو یہ لباس نظر نہیں آئے گا۔''

بادشاہ نے لڑکوں کی باتیں سنیں اور وزیر کو حکم دیا کے محل کے عقبی حصہ میں ایک کشادہ جگہ ان لڑکوں کو دے دی جائے اور ان کو مطلوبہ رقم بھی مہیا کر دی جائے۔

تینوں بھائی محل کے عقبی حصہ میں کپڑا بننے کی کھڈیاں اور کپڑا سینے کی مشینیں لے آئے۔ سونے کی تار تیار کرنے کے لئے بھاری رقم بھی حاصل کر لی اور کھٹا کھٹ خالی کھڈیاں چلانا شروع کر دیں۔ دس پندرہ دن کے بعد بادشاہ نے سپہ سالار سے کہا۔

"سپہ سالار! آپ جائیں اور دیکھیں کہ ان لڑکوں کا کام کہاں تک پہنچا ہے۔"

سپہ سالار جب محل کے عقبی حصہ میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں کپڑے کا نام و نشان نہیں ہے اور تینوں لڑکے کپڑا بننے کے انداز میں خالی ہاتھ خلاء میں ہلا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر انہیں بہت غصہ آیا اور وہ لڑکوں کو ڈانٹنے کے لئے آگے بڑھے ہی تھے کہ ان کو لڑکوں کی وہ بات یاد آئی کہ یہ لباس جھوٹے، بے ایمان اور فریبی شخص کو نظر نہیں آئے گا۔ کیوں کہ سپہ سالار کو اپنے جھوٹے پن اور بے ایمانیوں کا بخوبی اندازہ تھا اس لئے انہوں نے سوچا کہ ممکن ہے اسی وجہ سے ان کو لباس نظر نہ آرہا ہو۔ اس لئے انہوں نے اپنا بھرم رکھنے کے لئے بادشاہ کو اطلاع دی۔

"واہ حضور واہ! کیا لاجواب کپڑا تیار ہوا ہے۔ پوشاک دیکھ کر آپ کا دل باغ باغ ہو جائے گا۔"

تین چار دن بعد بادشاہ نے وزیر سے کہا۔

"وزیر صاحب! ہماری سالگرہ میں صرف دو دن رہ گئے ہیں۔ ابھی تک ہماری پوشاک نہیں آئی۔ آپ جائیں اور ان لڑکوں کی خبر لیں۔"

وزیر صاحب جب وہاں پہنچے تو انہوں نے بھی وہاں وہی منظر دیکھا جو سپہ سالار نے دیکھا تھا۔ لڑکے اسی طرح خلاء میں ہاتھ ہلا رہے تھے اور کسی قسم کے کپڑے کا وہاں نام و نشان نہ تھا۔ وزیر صاحب بھی اپنی جھوٹی اور فریبی طبیعت سے آگاہ تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی یہ سوچا کہ اسی وجہ سے ان کو بھی کپڑا نظر نہیں آرہا ہے۔ وزیر نے بادشاہ کو جا کر یہ رپورٹ دی۔

"حضور! لباس تقریباً تیار ہے۔ بے مثال پوشاک بنی ہے۔ آپ دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے۔ کل صبح وہ لڑکے شاہی لباس لے کر آئیں گے اور اپنے ہاتھوں سے آپ کو پہنائیں گے۔"

بادشاہ صاحب بہت خوش تھے۔ انہوں نے اعلان کروایا کہ کل شام وہ تمام درباریوں کے ساتھ گشت کریں گے اور لوگوں سے مبارک باد قبول فرمائیں گے۔

اگلے دن صبح سے ہی بادشاہ بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد تینوں لڑکے دو بڑے بڑے تھال لے کر محل میں آئے۔ بادشاہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تھال خالی تھے۔ پھر اس کو اپنے جھوٹ اور بے ایمانی کی داستانیں یاد آئیں اور لباس نظر نہ آنے کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ اس لئے اس نے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

"بھئی واہ! واقعی تم نے حق ادا کر دیا۔ یہ لاجواب لباس ہے۔"

سب درباری بھی جو اب تک حیران کھڑے تھے واہ واہ کرنے لگے۔ ان تینوں لڑکوں نے بادشاہ کے نزدیک آکر کپڑے تبدیل کرنے کے انداز میں بادشاہ کے آگے پیچھے چکر لگائے جب کہ سب لوگ بادشاہ صاحب کو فقط ایک سرخ رنگ کی نیکر میں دیکھ کر بہت مشکل سے ہنسی ضبط کر پا رہے تھے۔ اب اس شان سے جلوس نکلا کہ بادشاہ صاحب ننگی تلوار ہاتھ میں لیے سرخ نیکر پر تاج سجائے شاہی رتھ پر سینہ تانے کھڑے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف جمع لوگوں کو قہقہے لگاتا دیکھ کر بادشاہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی پوشاک کی تعریف ہو رہی ہے۔ اچانک بادشاہ کو ایک بچے کی آواز آئی جو اپنے باپ سے پوچھ رہا تھا۔

"ابا! بادشاہ سلامت ننگ دھڑنگ صرف ایک نیکر پہنے کیوں کھڑے ہیں؟"

"خاموش بے ادب اگر بادشاہ نے یہ سن لیا تو سزا ہو جائے گی۔"

☆☆

چچا تیز گام لیٹ ہو گئے

چچا تیز گام آپ سے ملنے کے لئے "تیز گام" میں سوار ہوئے تھے کہ "تیز گام" لیٹ ہو گئی۔ چچا تیز گام نے اطلاع دی ہے کہ وہ اگلے ماہ تک ضرور پہنچ جائیں گے۔

جوتا
میرا نام ہے



نعیم شاہد، اوکاڑا

مجھ سے تو آپ سب واقف ہوں گے جی ہاں، میں جوتا ہوں۔ ویسے تو میرے کئی نام ہیں، مثلاً سینڈل اور چپل وغیرہ لیکن میرا سب سے مشہور نام جوتا ہے۔ اگرچہ آپ سب مجھ سے واقف ہیں، لیکن آپ میں سے اکثر بچوں کو معلوم نہیں ہوگا کہ میں بنتا کس طرح ہوں؟ تو چلیے آج میں آپ کو مختصراً بتاتا ہوں کہ میں کیسے بنتا ہوں؟

آپ نے دیکھا ہوگا کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر مختلف جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے اور آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ کئی لوگ اور مختلف اِداروں کے افراد قربانی کے جانور کی کھال لینے کے لئے آتے ہیں۔ جن لوگوں کو قربانی کے جانور کی کھال فروخت کی جاتی ہے، وہ اُن کھالوں کو نمک لگا کر محفوظ کر لیتے ہیں کیوں کہ نمک لگانے سے کھال خراب نہیں ہوتی۔ پھر اُن کھالوں کو دھو کر مختلف طرح کے کیمیائی عمل سے گزارنے کے بعد ان سے چمڑے کی جیکٹیں، چمڑے کے پرس، بے شمار دُوسری اشیا اور جوتے بھی بنائے جاتے ہیں۔ چمڑے سے بنے ہوئے جوتے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ چمڑے کے علاوہ ریکسین سے بھی جوتے بنائے جاتے ہیں، جو دیکھنے میں لگتے تو چمڑے ہی کی طرح کے ہیں، لیکن چمڑے سے بنے ہوئے جوتوں کی طرح مضبوط نہیں ہوتے۔

اس کے علاوہ کاٹن اور زین کے کپڑے سے بھی جوتے بنائے جاتے ہیں جو آپ کھیل کود کے وقت پہنتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سکولوں میں بچے سفید جوتے پہنے پی ٹی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ جوتے کپڑے (زین) کے بنے ہوتے ہیں اور بہت ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ آج کل مصنوعی پولیمر سے ایک بالکل نئی طرح کے جوتے بنائے جا رہے ہیں جو آپ سب بچوں میں بہت مقبول ہیں۔ آپ انہیں بہت شوق سے پہنتے ہیں۔ جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک سمجھے، میں جوگرز کی بات کر رہا ہوں۔ یہ ہلکے پھلکے ہوتے ہیں، مگر مضبوط بھی بہت ہوتے ہیں۔

ہاں تو پیارے بچو! یہ تو تھا کچھ میرے خاندان کا تعارف۔ ویسے میری زندگی بہت عجیب ہے۔ مجھے دُوسروں کے کام آکر بہت خوشی ہوتی ہے۔ جب بچے مجھے اپنے نرم نرم پیروں میں پہنتے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے اور بہت اچھا بھی لگتا ہے، لیکن مجھے اکثر بچوں سے شکایت بھی رہتی ہے کہ وہ میری صفائی کا ذرا سا بھی خیال نہیں

رکھتے۔ مجھے باقاعدگی سے روزانہ پالش نہیں کرتے، جس سے میری خوبصورت جلد خراب ہو جاتی ہے، میری عمر کم ہو جاتی ہے اور میں جلد ٹوٹ جاتا ہوں۔

اکثر بچے صبح صبح مجھے بغیر پالش کیے یوں ہی پہن کر سکول چلے جاتے ہیں۔ اور جب کلاس ٹیچر ایسے بچوں کو کلاس میں کھڑا کروا کر اُن کی توجہ جوتوں یعنی میری جانب دلاتے اور انہیں ڈانٹتے ہیں تو بچوں کو تو شرمندگی ہوتی ہی ہے، خود مجھے بھی بہت شرمندگی ہوتی ہے۔ البتہ کچھ ایسے پیارے اور اچھے بچے بھی ہیں جو روزانہ رات کو سونے سے پہلے مجھے اچھی طرح پالش کر کے چمکا کر رکھ دیتے ہیں تا کہ صبح وقت ضائع کیے بغیر تیار ہو کر سکول جا سکیں۔ بعض بچے مجھے رات کو بھی پالش نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ صبح کر لیں گے حالانکہ صبح اُن کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا اور یوں وہ مجھے بغیر پالش کیے ہی پہن کر سکول کی جانب بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

پیارے بچو! آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ آج میں کن باتوں کو لے کر بیٹھ گیا ہوں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ آج آپ سب سے باتیں کروں۔ اُمید ہے میں آج جو کچھ بھی آپ سے کہوں گا، آپ اُس پر ضرور غور کریں گے اور اُس بارے میں سوچیں گے۔

کچھ ساتھی یہ کرتے ہیں کہ سکول سے واپس آتے ہوئے راستے میں پڑے ہوئے پتھروں اور دُوسری چیزوں کو ٹھوکریں مارتے رہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس طرح میری چمک دار اور نازک جلد خراب ہو جاتی ہے اور مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ چلیے میری بات چھوڑیے، انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ اس طرح کی حرکت کرنے سے وہ اپنے والدین کا نقصان کرتے ہیں۔ کچھ بچے مجھے پہن کر پتھروں کو ٹھوکریں مارتے رہتے ہیں تو کچھ بچے مجھے پہن کر پانی اور کیچڑ میں بھاگتے ہیں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے کیوں کر اس طرح میری سلائی اُدھڑ جاتی ہے اور میں جلد خراب ہو جاتا ہوں۔

کچھ ساتھی مجھے پہن کر یہ سب حرکتیں کرتے ہیں تو کچھ چھوٹے بچے ایسے بھی ہیں جو مجھے سرے سے پہنتے ہی نہیں۔ ان کے والدین انہیں بہت سمجھاتے ہیں، لیکن وہ اُن کی بات نہیں مانتے۔ ایسے بچے سردیوں میں مجھے پہنے بغیر ہی ٹھنڈے فرش اور صحن میں گھومتے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں انہیں ٹھنڈ لگ جاتی ہے اور وہ بیمار ہو جاتے ہیں۔ جہاں ان کے ماں باپ اور گھر کے دُوسرے افراد کو پریشانی ہوتی ہے، وہیں بیمار ہونے والے بچے کو طرح طرح کی کڑوی دوا کھانی اور پینی پڑتی ہے۔ اس لئے میری ایسے تمام بچوں اور ساتھیوں سے گزارش ہے کہ وہ ننگے پاؤں مت پھرا کریں کیوں کہ ٹھنڈ لگنے سے بیمار ہونے کے علاوہ ان کے پاؤں میں کوئی نوکیلی چیز بھی چبھ سکتی ہے، لہذا کبھی ننگے پاؤں باہر گلی میں مت نکلیں۔ ہمیشہ مجھے پہن کر باہر نکلا کریں۔

کچھ بچے ایسے بھی ہیں، جن کے پاس پہننے کے لیے سرے سے جوتے ہی نہیں کیوں کہ وہ بہت غریب ہیں۔ اُن کے پاس اتنے پیسے ہی نہیں ہوتے کہ وہ مجھے خرید سکیں۔ میں جب بھی ایسے غریب بچوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے دُکھ ہوتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں خود بھاگ کر ایسے بچوں کے پیروں میں چلا جاؤں، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا کیوں کہ آپ سب جانتے ہیں میں بے جان ہوں۔ اگرچہ میں خود ایسے بچوں کی مدد نہیں کر سکتا، لیکن میں ایسے بہت سے پیارے پیارے رحم دل بچوں کو جانتا ہوں جو اپنے پرانے جوتے غریب بچوں کو پہننے کے لیے دے دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں اور بچوں سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتے ہیں جو دُوسروں کی مدد کرتے ہیں، اس لئے آپ کو چاہیے کہ آپ مجھے پرانا ہونے پر یوں ہی کوڑا کرکٹ میں مت پھینک دیا کریں بلکہ اپنے امی ابو یا بڑے بہن بھائی کے ساتھ جا کر کسی غریب کو دے دیا کریں تا کہ وہ بیچارہ غریب بھی مجھے پہن سکے۔

---☆☆---



معلوماتِ عامہ

☆غلاف خانہ کعبہ ہر سال ذوالحجہ کو تبدیل کیا جاتا ہے۔
☆اس کا ہدیہ 2 کروڑ ریال ہے۔
☆اس کا وزن 670 کلوگرام ہوتا ہے۔
☆یہ خالص ریشم کے کپڑے سے بنتا ہے۔
☆اس کی تیاری میں 150 کلوگرام سونا اور چاندی لگتا ہے۔
☆اس کا سائز 658 مربع میٹر ہے۔
☆یہ 47 حصوں پر مشتمل ہے۔
☆ہر حصہ 14 میٹر لمبا اور 95 سینٹی میٹر چوڑا ہے۔
☆اس کو تبدیل کرنے میں 4 گھنٹے کا وقت لگتا ہے۔
☆ریچھ درخت پر پیٹھ کے بل چڑھتا ہے۔
☆دُنیا کا سب سے بڑا چڑیا گھر لندن میں ہے۔
☆کچھوے کی اوسط عمر 120 سال ہوتی ہے۔
☆چیتے کی اوسط رفتار 75 میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔
☆دُنیا میں سب سے زیادہ بندر بھارت میں پائے جاتے ہیں۔
☆لومڑی کی دُم کی لمبائی اس کے جسم سے نصف ہوتی ہے۔
☆دُنیا کا سب سے سست رفتار جانور گھونگا ہے۔
☆چوہے کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔
☆مینڈک اپنی ناک کے علاوہ کھال سے بھی سانس لیتا ہے۔

(ضیاء الرحمن ضیاء، ساہی وال)

☆"بغداد الجدید" پاکستان کے شہر بہاول پور کو کہتے ہیں۔
☆"پاکستان کا دل" لاہور کو کہا جاتا ہے۔
☆"بھارتی ٹینکوں کا قبرستان" سیال کوٹ کو کہتے ہیں۔
☆"شاہینوں کا شہر" پاکستان کے شہر سرگودھا کو کہا جاتا ہے۔
☆"اولیائے کرام کا شہر" ملتان کو کہتے ہیں۔
☆"عروس البلاد" کراچی کو کہا جاتا ہے۔
☆"پاکستان کا سوئٹزر لینڈ" خوب صورت شہر سوات کو کہتے ہیں۔
☆فیصل آباد کو "پاکستان کا مانچسٹر" کہا جاتا ہے۔

(محمد خرم خالد، کراچی)

☆کویت کا شمار دُنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں عوام سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔
☆ایشیاء کا سب سے صاف ستھرا شہر سنگاپور ہے۔
☆اونٹ پانی سے بہت ڈرتا ہے۔
☆آدم خور درخت افریقہ میں پائے جاتے ہیں ان کا کوئی بتا سونگھ لے تو وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔
☆پاکستان میں کھیلوں کا سامان سیال کوٹ میں بنایا جاتا ہے۔
☆پاکستان دودھ پیدا کرنے والا دُنیا کا پانچواں بڑا ملک ہے۔
☆اسلامی ممالک میں صرف پاکستان ایٹمی قوت رکھتا ہے۔

(عدیل اصغر، بہاول پور)

☆فالکن دُنیا کا سب سے تیز ترین اڑنے والا پرندہ ہے۔
☆دُنیا کا سب سے لمبا جانور زرافہ ہے۔
☆پرندوں میں ہنس کی عمر سب سے لمبی ہوتی ہے۔
☆چیتے کی زیادہ سے زیادہ زندگی 12 سے 17 سال تک ہوتی ہے۔
☆شارک مچھلی کے چوبیس دانت ہوتے ہیں۔

(عثمان ارشد شانی، فیصل آباد)

☆ٹیکسلا کا لفظی معنی پتھروں کا شہر ہے۔
☆خالص ہیرے کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔
☆16 ستمبر 1971ء کو پاکستانی روپیہ ڈالر سے وابستہ کیا گیا تھا۔
☆زیادہ تر خواب 5 سے 20 منٹ تک کے ہوتے ہیں۔
☆فرانس کے کُل 99 صوبے ہیں۔

(محمد اسد، میاں والی)

☆یکم ستمبر 1923ء کو جاپان میں آنے والے ہولناک زلزلے سے 1 لاکھ 30 ہزار افراد ہلاک ہوئے تھے۔
☆دُنیا کا سب سے بڑا خوف ناک سیلاب چین کے دریائے ہولنگ میں 1887ء کو پیش آیا جس میں 9 لاکھ افراد لقمۂ اجل بنے تھے۔

(عروج فاطمہ، کنزیٰ ناز، لاہور)



درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ سورۂ رحمٰن کو کس نام سے پکارا جاتا ہے؟
i۔ قلب القرآن ii۔ عروس القرآن iii۔ باب القرآن

2۔ غلاموں میں سب سے پہلے کس نے اسلام قبول کیا تھا؟
i۔ حضرت بلالؓ ii۔ حضرت انسؓ iii۔ حضرت زید بن حارثؓ

3۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو مسلمانوں کی طرف سے سب سے پہلے کون سا ہتھیار چلانے کا اعزاز حاصل ہے؟
i۔ تلوار ii۔ برچھی iii۔ تیر

4۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے والد کا کیا نام تھا؟
i۔ حضرت عمر فاروقؓ ii۔ حضرت عثمان غنیؓ iii۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ

5۔ اٹلی کے سکے کو کیا کہتے ہیں؟
i۔ لیرا ii۔ ڈالر iii۔ ریال

6۔ اولمپک کھیلوں کا آغاز کس ملک سے ہوا تھا؟
i۔ فرانس ii۔ امریکہ iii۔ یونان

7۔ کس ملک کے پرچم کو "یونین جیک" کہا جاتا ہے؟
i۔ سعودی عرب ii۔ برطانیہ iii۔ روس

8۔ پاکستان کا کون سا شہر ٹیلی فون انڈسٹری کی وجہ سے مشہور ہے؟
i۔ واہ کینٹ ii۔ گجرات iii۔ ہری پور ہزارہ

9۔ عمران اور کرنل فریدی کے کردار کس ناول نگار کے تخلیق کردہ ہیں؟
i۔ ابن صفی ii۔ اے حمید iii۔ رتن ناتھ سرشار

10۔ محاورہ مکمل کریں۔ ایک انار .... بیمار
i۔ دو ii۔ سو iii۔ دو سو

جوابات علمی آزمائش مارچ 2010ء

1۔ بیر 2۔ حضرت ابوہریرہؓ 3۔ سورج گرہن 4۔ وٹامن اے اور ڈی 5۔ ناسا 6۔ نائٹروجن یا آرگن 7۔ ہوا کا دباؤ 8۔ فرانس 9۔ درہ کھوجک۔ 10۔ خواجہ حسن نظامی۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ محمد نبیل مہتاب، میاں والی (200 روپے کی کتب)
☆ انظر سعید، کراچی (175 روپے کی کتب)
☆ محمد آفتاب عالم سرحدی، کرک (125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: رانا محمد ابراہیم لاہور۔ محمد عمیر رحیم یار خان۔ جنید نعیم دیوان حویلی لکھا۔ ایمن اعجاز کراچی۔ آسیہ ظاہر خان کوئٹہ۔ عاقب سفیان بھکر۔ لیلیٰ شفق سیال کوٹ۔ وجیہ شبیر راول پنڈی۔ عدیل جہانگیر لاہور۔ سارہ جاوید وہاڑی۔ سید محمود الحسن، وہاڑی۔ صبا فاطمہ جھنگ۔ نور العین عنصر راول پنڈی۔ فرح ناز، کراچی۔ محمد مبشر سلیم، رحیم یار خان۔ علی زین لاہور۔ طلحہ نوید راول پنڈی۔ ارتاء طاہر ملک منگلا کینٹ۔ رملہ صدیقی سرگودھا۔ رطابہ تنویر ایبٹ آباد۔ کشف قریشی بہاول پور۔ مرزا شہیر بیگ ملتان۔ مسفرہ زینب کھوکھو لاہور۔ حافظ غلام غوث لاہور۔ محمد سعید الحسن حافظ آباد۔ عائشہ صدیقہ اوکاڑا۔ ندا آصف تربیلا۔ نمرہ شاہین خوشاب۔ تاشف احمد لاہور۔ عاقب روانہ، محمد آصف روانہ سرگودھا۔ زینب ظفر حسن ابدال۔ انعم معراج، آمنہ ظفر لاہور۔ تنزیلہ اسلم گوجرانوالا۔ محمد سلیمان غنی لاہور۔ ردا نوید اسلام آباد۔ دامن زہرا، فارحہ سہیل اسلام آباد۔ حمزہ عبد الرحمٰن میاں والی۔ کائنات فاطمہ گجرات۔ مدثرہ خلیل دینہ۔ مصباح ظفر رحیم یار خان۔ سید فرخ محمود راول پنڈی۔ طہ یاسین حیدر آباد۔ عمارہ حسن راول پنڈی۔ ارم نسیم خان کراچی۔ عکاشہ احمد مغل گجرات۔ ہارون الرشید جہلم۔ شہریار حیدر جہلم۔ نور فرید خدیجہ فرید ولید فرید، کراچی۔ موسیٰ عمران، نور العین، عروج فاطمہ، ماروشہ عزیز، خنسا رضوان لاہور۔ ردا مقبول شمالی وزیرستان۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اپریل 2010

دماغ لڑاؤ

نام: ____________________

مقام: ____________________

پتا: ____________________

اپریل فول



بھلا کیوں منائیں ہم اپریل فول
نہ یہ اپنا شیوہ نہ اپنا اُصول



یہ یورپ کا دستور ہے دوستو
مناتے ہیں وہ پہلی اپریل کو

اُڑاتے ہیں اِک دُوسرے کا مذاق
ہے زیبا انھیں کو اُڑانا مذاق

بناتے ہیں احمق وہ چاہیں جسے
بہت خوش وہ ہوتے ہیں اس بات سے



غلط بات کا بھی دِلا کر یقیں
پشیمان وہ اُس روز ہوتے نہیں

مہذب طریقے سے دے کر فریب
سمجھتے نہیں اُس کو ہر گز وہ عیب



اُڑائیں مذاق ہم کسی کا کہیں
اجازت ہمیں دین دیتا نہیں

سکھاتا ہے اسلام اچھے اصول
کہیں بھی نہیں ایسے سچے اُصول



جو دل ٹوٹ جائے تو جڑتا نہیں
بنا پر ، پرندہ بھی اُڑتا نہیں

عمل ایسا ہو جس سے راضی ہو رب
رہیں خوش ضیاؔ اس کے بندے بھی سب

ضیاء الحسن ضیاء، کراچی

نذیر انبالوی

PAKISTAN POST
خدمت، دیانت، امانت





کمال احمد صاحب
مکان نمبر 70، گلی نمبر 10
شاداب نگر، لاہور

کہانی ایک خط کی

میں کالج سے لوٹا تو میز پر پڑے خطوط میرے منتظر تھے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں خطوط پڑھنے لگ گیا۔ دو خط رسائل کے مدیران کے تھے جن میں انہوں نے نئی کہانیاں ارسال کرنے کے لئے لکھا تھا۔ ایک خط میرے گہرے دوست شاہد کا تھا۔ ایک خط کی عبارت پڑھ کر میں چونکا۔ یہ خط میرے ایک پرستار نے لکھا تھا۔ یہ خط پڑھ کر میں پریشان سا ہو گیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس خط کا کیا جواب لکھوں۔ میرے پرستار نے اپنے خط میں جو سوال پوچھا تھا میں نے اُس بارے میں کبھی سوچا تک نہ تھا۔ میں الجھن سی محسوس کرنے لگا۔ میں نے اس خط کو نظرانداز کرنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ یہ خط تو گویا میرے اعصاب پر چھا گیا تھا۔

میں شام کے وقت کرکٹ کھیلنے گراؤنڈ میں گیا تو پریشانی کے باعث کھیل میں دل نہ لگا۔

”بھئی کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو؟“ سجاد نے پوچھا۔

”ہاں یار اس خط نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔“ میں نے خط جیب سے نکال کر اپنے دوست کی طرف بڑھایا۔

”اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے، جو کچھ پوچھا ہے سچ سچ لکھ دو۔“

”کیا کہا سچ سچ لکھ دوں!“ میں نے اپنے دوست کی بات درمیان سے اچک لی۔

”ہاں بھئی بالکل سچ لکھ دو، سچ لکھنے میں کیا حرج ہے؟“

سجاد کی بات سن کر میں خاموش ہو گیا۔ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ میں سچ کیوں نہیں لکھ رہا؟

رات کالج کا کام کرنے کے بعد میں نے ایک کہانی لکھنے کی کوشش کی مگر اپنی جیب میں رکھے خط کا خیال آتے ہی کہانی کا خاکہ الجھ کر رہ گیا۔

میں نے خط جیب سے نکال کر میز پر رکھا اور گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ اسی سوچ میں گم ماضی کے دریچے کھلنے لگے۔

ایک دن کالج میں ابھی دو پیریڈ رہتے تھے کہ میں وہاں سے نکل آیا۔ میرے قدم بڑی سڑک سے ہوتے ہوئے ایک تنگ سی گلی کی طرف بڑھے۔ تنگ گلی کے درمیان میں پہنچ کر ایک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

”ایکشن سے بھرپور فلم...... مزے دار...... جلدی آؤ......

صرف دس روپے میں...... صرف دس روپے...... مزے دار فلم...... جلدی آؤ...... جلدی آؤ......"

دس روپے ادا کرنے کے بعد میں ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں پہلے ہی بہت سے نوجوان اور بچے بیٹھے تھے۔ میں خاموشی سے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ جب ساری جگہ پُر ہو گئی تو سامنے ایک اور اونچے سے چبوترے پر ٹیلی ویژن کی اسکرین پر فلم چلنا شروع ہو گئی۔

فلم واقعی مزے دار تھی۔ فلم دیکھتے ہوئے میں بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"لگتا ہے گھر بتا کر نہیں آئے۔" میرے پاس بیٹھے ایک نوجوان نے کہا۔

"نہیں...... نہیں...... میں بتا کر آیا ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

فلم دیکھ کر میں تین بجے گھر پہنچا تو امی جان نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"امی جان! ان دنوں ہمارے کالج میں تقریری مقابلے ہو رہے ہیں بس اسی لئے دیر سے آیا ہوں۔"

میرے جواب سے امی جان خاموش ہو گئیں۔ انہیں یقین تھا کہ میرا بیٹا جھوٹ نہیں بولتا۔

یکم اپریل کا وہ دن بھی میرے حافظے میں محفوظ تھا جب میں نے عمران کے ہاں فون کر کے اُسے فول بنایا تھا۔ کتنا مزا آیا تھا۔ میں نے عمران کے گھر فون کیا تو دُوسری طرف سے کہا گیا تھا۔

"میں عمران بول رہا ہوں۔"

"عمران صاحب آپ کے لئے ایک بہت بُری خبر ہے۔"

"بُری خبر، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... آپ کون ہیں اور کہاں سے فون کر رہے ہیں؟"

"میں ڈاکٹر تبسم ہوں، آپ کے ابو کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے وہ اس وقت سول ہسپتال میں داخل ہیں، آپ فوراً جائیں۔"

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے عمران کی زبانی بعد میں معلوم ہوا تھا کہ اس غلط فون کے باعث ان کے گھر میں کہرام مچ گیا تھا اور ان کی امی بے ہوش ہو گئی تھیں۔

"جس نے بھی یہ فون کیا تھا اللہ تعالیٰ اُسے ہدایت دے۔" عمران کی بات سن کر میں نے فوراً کہا تھا۔

ایک شام میں کہانی لکھنے میں مصروف تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"اوئے رحمو! دیکھو کس کا فون ہے؟"

رحمو نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔

"جی رحمو بول رہا ہوں۔"

"میں عاصم بول رہا ہوں۔ آپ کمال صاحب کو بلا دیں۔" دُوسری طرف سے کہا گیا۔ رحمو نے مجھے عاصم کے بارے میں بتایا تو میں فوراً بولا۔

"رحمو! بس تم ٹال دو، کہہ دو میں گھر میں نہیں ہوں۔"

"صاحب جی! یہ تو جھوٹ ہے۔"

"بس...... بس بڑے آئے سچ بولنے والے...... جو کہا ہے وہ کرو......"

میں نے اُسے ڈانٹا۔ رحمو نے میرے کہنے پر جھوٹ بولا۔ پھر میں خاموشی سے کہانی لکھتا رہا۔

میٹرک کا امتحان شروع ہونے میں ایک ہفتہ رہتا تھا۔ میں کہانیاں لکھنے میں اس قدر مصروف تھا کہ پڑھائی کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ کہانیاں لکھنے کا بھوت سر پر سوار تھا۔ ڈیٹ شیٹ آئی تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہوا، مگر ایک راستہ دیکھ کر مجھے ذرا سی تسلی ہوئی۔ وہ راستہ نقل کا تھا۔ میں نے تمام پرچے نگران کے تعاون سے حل کئے اور اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا۔ گھر والے میری کامیابی پر بہت خوش تھے۔ میں خوشی کے عالم میں بے ایمانی کو یکسر بھول گیا تھا۔ میں نے جب بھی اس بارے میں سوچا یہ کہہ کر دل کو تسلی دی کہ اب ایسا کرنا کامیابی کے لئے بہت ضروری ہے۔

ان گزرے ہوئے واقعات نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میری پیشانی پر ہلکے ہلکے پسینے کے قطرے تھے۔ میرے سرستار کا خط بدستور میرے سامنے پڑا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میرا

مذاق اڑا رہا ہو۔ میں نے اس کو پھاڑنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا مگر ایسا نہ کر سکا۔

"یا الٰہی میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں؟ اس خط نے تو میرا سکون چھین لیا ہے۔" میں بڑبڑایا۔

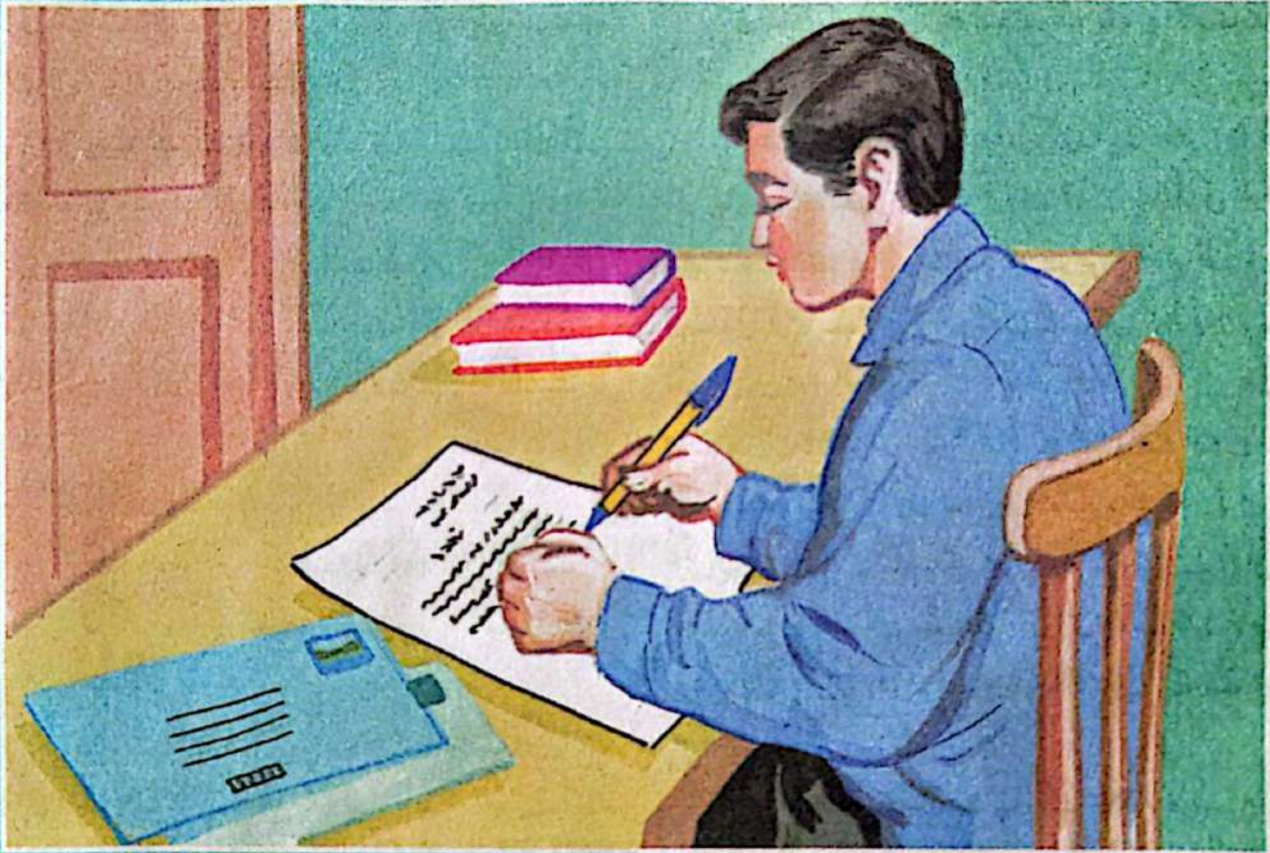
خط کو فائل میں رکھنے کے بعد میں اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ رت بہت دیر سے سونے کی وجہ سے جب میں صبح اٹھا تو میری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں جب کالج میں داخل ہوا تو سہیل میری طرف لپکا۔

"کمال! مبارک ہو......"

"کس بات کی مبارک......؟" میں نے پوچھا۔

تمہیں آل پاکستان کہانی نویسی کے مقابلے میں اول انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ یہ دیکھو آج کے اخبار میں اس مقابلے کی خبر چھپی ہے۔"

میں یہ سن کر اخبار پر جھک گیا۔ میری گردن فخر سے تن گئی۔ میں برسوں سے جو خواب دیکھ رہا تھا آج اس کی تعبیر مل گئی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ لیکن میری خوشی اس وقت مایوسی میں بدل گئی جب پہلے پیریڈ کے دوران میں نے فائل کھولی تو میرے پرستار کا خط میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ میں جھنجلا سا گیا۔ یہ خط مجھے زہر لگنے لگا۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کیا کہ میں اس خط کا جواب آج ہی لکھوں گا۔ میں فری پیریڈ میں اس خط کا جواب لکھنے کے لئے لائبریری میں بیٹھ گیا۔ میں نے کئی بار خط کو بغور پڑھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا لکھوں۔ میں اگر سچ لکھتا تو ایک نام ور ادیب بے نقاب ہوتا تھا اور اگر جھوٹ لکھنے کے بارے میں سوچتا تو میرا قلم رک جاتا تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر خط پر نگاہ ڈالی، لکھا تھا۔



محترم کمال احمد صاحب

السلام علیکم

میں مختلف رسائل میں آپ کی کہانیاں پڑھتا رہتا ہوں۔ آپ میرے پسندیدہ ادیب ہیں۔ آپ بچوں کے لئے بہت بامقصد اور اصلاحی کہانیاں لکھتے ہیں۔ اتنی اچھی کہانیاں لکھنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ بھی اپنی کہانیوں کے کرداروں کی طرح سچے، کھرے، محبِّ وطن، انسانوں سے پیار کرنے والے، مظلوموں کی حمایت کرنے والے اور حق کی راہ پر چلنے والے ہیں؟ مجھے اُمید ہے آپ اس سوال کا سچ سچ جواب دیں گے۔ مجھے آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

آپ کا پرستار

طارق اقبال، لاہور

میں نے کچھ سوچ کر خط لکھنا شروع کیا۔ میرا قلم تیزی سے چلنے لگا۔ میں ہر بات سچ سچ لکھتا رہا۔ جب خط مکمل ہوا تو میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے ایک بہت بڑے عذاب سے نجات مل گئی ہو۔ میں نے تھوڑی دیر قبل جو کچھ لکھا تھا۔ ایک نظر اُس پر ڈالی۔

محترم طارق اقبال صاحب

السلام علیکم

آپ کا خط ملا۔ خط لکھنے اور میری کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ نے جو سوال پوچھا ہے اس کا جواب پڑھ کر یقیناً آپ کو مایوسی ہو گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں میرے بارے میں جو اچھے احساسات ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں۔ آپ نے سچ لکھنے کے لئے کہا ہے اس لئے میں سچ ہی لکھوں گا۔ میں اپنی کہانیوں کے کرداروں کے بالکل برعکس ہوں۔ میں خود تو دُوسروں کو جھوٹ نہ بولنے کی تلقین کرتا ہوں، مگر خود جھوٹ بولتا ہوں۔ انسانوں سے پیار کرنا اکثر میری کہانیوں کا موضوع ہوتا ہے، مگر میں خود کبھی اس پر عمل نہیں کرتا۔ میں اچھا ادیب تو بن گیا ہوں مگر افسوس اچھا انسان نہ بن سکا۔ میں نے آپ کے خط سے قبل کبھی اس بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ میں اب اچھا انسان بننے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنی کہانیوں کے کردار کی طرح سچا انسان بنوں گا۔ جو کچھ لکھوں گا خود بھی اس پر عمل کروں گا۔ میں آج تک بے شمار کہانیاں لکھ چکا ہوں، مگر یہ خط لکھ کر مجھے جو خوشی ملی ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ اُمید ہے آپ آئندہ بھی مجھے خط لکھتے رہیں گے۔

والسلام

کمال احمد

ان بچوں نے بھی بلاعنوان کے اچھے عنوان بھیجے

زینب عظیم، عمیر جاوید، لائبہ شاہد، محمد ابراہیم، آمنہ بی بی، عبد الرحمٰن، سید رضا عباس، اقصیٰ طاہر، فاطمہ الزہرا، اسامہ ندیم، صالحہ احمد، سارہ احمد، محمد احمد، مریم احمد، شہزر عظیم، شذرے عظیم، لاہور۔ مصباح نسیم، انس نسیم، ارم نسیم، سیدہ نادیہ یاسمین، صفورہ اصفی کراچی۔ نور العین، امامہ شاکر، محمد علی، سید فرخ محمود، عائشہ نوید، فاطمہ نوید، راول پنڈی۔ رمشا نوید، ماہین آصف، قراۃ العین، دامنِ زہرا۔ نبیلہ شیخ، سید عطاء المنعم بدر، عمیر محمد ظفر، علی ندیم، اسلام آباد۔ طٰہٰ یٰسین، فرحال بیگ، حیدر آباد۔ اعتزاز مصطفیٰ، جنید خان، حسین طالب، پشاور۔ زرش فاطمہ، ارتضٰی حیدر، مریم کامران، زینب کامران، آمنہ کامران، سرگودھا۔ کنور محمد سعید، مرزا سالار بیگ، محمد ضغیم سردار، نور فاطمہ، حرا قریشی، ملتان۔ آسیہ ظاہر، کوئٹہ۔ ہارون الرشید، محمد عمار بٹ، جہلم۔ اسامہ خان، امل قریشی، عدیل اصغر، بہاول پور۔ معاذ احمد صدیقی، ذیشان احمد صدیقی کندیاں۔ فرخ حیات، پیر محل۔ محمد تنویر انگراء پیلو وینس، محمد جعفر، خوشاب۔ سہیل بٹ، طیب الرحمٰن، کائنات فاطمہ، شہناز مظفر، حسن ارشاد، اسماء ارشاد گجرات۔ بسامہ تنویر ایبٹ آباد۔ علی شہروز، محمد داؤد، محمد ابتسام الحق، اقصیٰ بتول فیصل آباد۔ محمد حسان ارشد، عفیرہ ارشد، محمد عزیز الرحمٰن گوجرانوالا۔ فاطمہ جمیل شیخوپورہ۔ حسن وقاص، شفق شیکی اقبال، غالب نسیم، سیال کوٹ۔

☆☆

ہونہار مصور

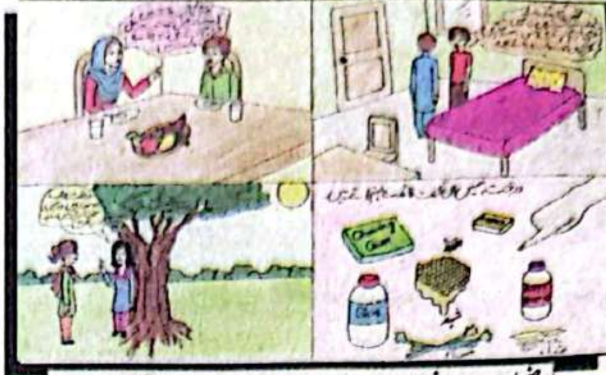
درخت ہمارے دوست



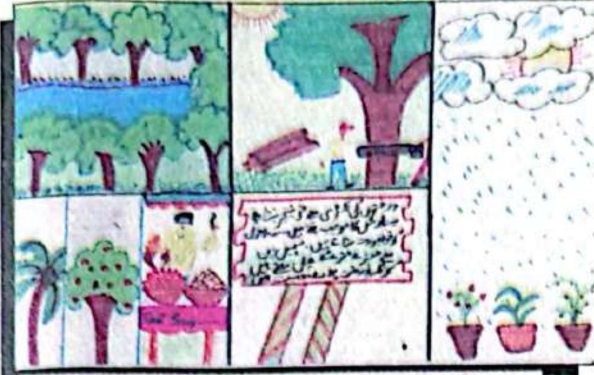
تصاویر صرف اُفقی رُخ میں ہی بنائیں







ضحیٰ جاوید، شیخوپورہ (پہلا انعام: 175روپے کی کتب)



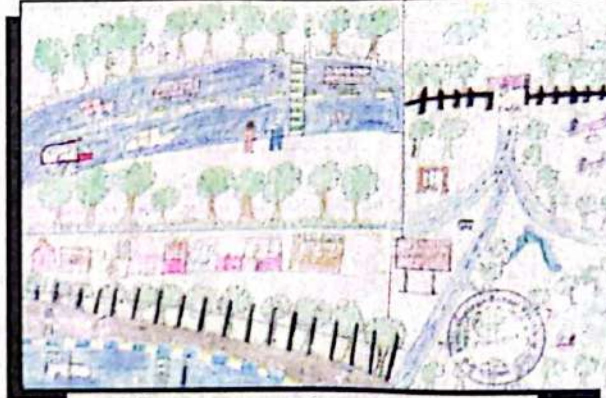
عقیقہ فخر، چکوال (دُوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)



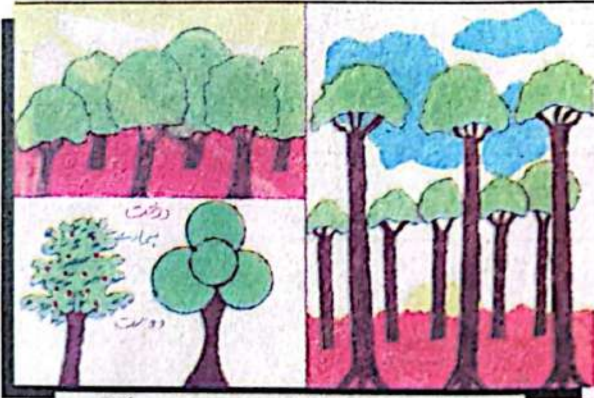
ماہ رخ امین، راول پنڈی (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)



عفیفہ عارف، لاہور (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)



ماہ رخ شاہد، ننکانہ صاحب (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)



محمد جنید حفیظ، ڈیرا غازی خان (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: اُمیمہ ضیاء، ساریہ ضیاء کوئٹہ۔ فریحہ اشرف کراچی۔ مرزا حسن صدیق، منڈی بہاؤ الدین۔ علی زیب خالد، حسن ارشاد، محمود گجرات۔ محمد سلطان فاروقی قصور۔ ماریہ بنت طارق راول پنڈی۔ میمونہ مقدس ساہی وال۔ سلمیٰ صفی ثمن، نازش توقیر، عاقب رباب چکوال۔ محمد شفیق بھٹی کراچی۔ محمد نعمان اٹک۔ مریم طارق، خدیجہ یعقوب فیصل آباد۔ یمنہ انوار، عبد الرحمٰن اسلام آباد۔ ردا مقبول لاہور۔ محمد مزمل حسین ساہی وال۔ رحما سعدیہ گوجرانوالا۔ وقاص مصطفیٰ جھنگ۔ حفصہ کوثر میاں چنوں۔ محمد عامر بہاول پور۔

مئی کا موضوع: تعلیم وتربیت کا تخیل — آخری تاریخ 8 اپریل

جون کا موضوع: طلوع آفتاب کا منظر — آخری تاریخ 8 مئی

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

CamScanner

میری زندگی کے مقاصد

حسنین رزاق، کراچی



ماں باپ کی خدمت کرنا اور اسلام کی حفاظت کرنا میری زندگی کا مقصد ہے۔

رنا طاہر، منگلا



میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ جس کے لیے میں بہت محنت کر رہی ہوں۔

محمد احمد، فیصل آباد



میں بڑا ہو کر لیکچرر بنوں گا اور طلباء کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کروں گا۔

انتزار مصطفیٰ، پشاور



میں چاہتا ہوں کہ فوجی بن کر ملک کی حفاظت کروں۔

عائشہ اسلم، لاہور



میری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ میں ڈاکٹر بن کر غریب مریضوں کا مفت علاج کروں گی۔

رمشا نوید، اسلام آباد



میں بڑی ہو کر انجینئر بنوں گی اور ملک کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لوں گی۔

شیخ محمد مبشر سلیم، رحیم یار خان



میں بڑا ہو کر ایک مسجد بنوانا چاہتا ہوں جس میں صبح شام قرآنی تعلیم کا انتظام ہو گا۔

محمد ریان فیصل خان، ولوکینٹ



میں پاک آرمی میں جا کر اپنے ملک کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کروں گا۔

حرم آفتاب، فیصل آباد



میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور مریضوں کو بیماریوں سے نجات دلاؤں گی۔

عبید فاطمہ، قلعہ دیدار سنگھ



بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا اور والدین کی خدمت کرنا میری زندگی کا مقصد ہے۔

ودم حماد صدیقی، اسلام آباد



میں دُنیاوی اور دینی تعلیم حاصل کر کے ایک مثالی پاکستانی شہری بننا چاہتی ہوں۔

شہباز خان، پشاور



میں قرآن مجید حفظ کر کے عالم دین بننا چاہتا ہوں۔

طلحہ نوید، راول پنڈی



میرا نصب العین یہ ہے کہ میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بن کر لوگوں کی خدمت کروں۔

ذیشان محمود، لاہور



میری زندگی کا اہم مقصد ملک و قوم کے لئے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینا ہے۔

حافظ محمد عاکف، کراچی



میں عالم دین بن کر اسلام کی روشنی پوری دُنیا میں پھیلاؤں گا۔

عمیر جاوید، لاہور



میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

حذیفہ افتخار، پیرووال



میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور ملک کی حفاظت کروں گا۔

محمد معیز فیصل خان، ولوکینٹ



میں پائلٹ بن کر قوم کی خدمت کروں گا۔

مستجاب احمد فاروق، لاہور



میں انجینئر بن کر ملک کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لوں گا۔

عون احمد، فیصل آباد



میں بڑا ہو کر الیکٹریکل انجینئر بنوں گا اور ملک کو بجلی کے بحران سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔

روا رمیس، لاہور



میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریب لوگوں کا مفت علاج کروں گی۔

میری زندگی کے مقاصد کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام .... شہر ....

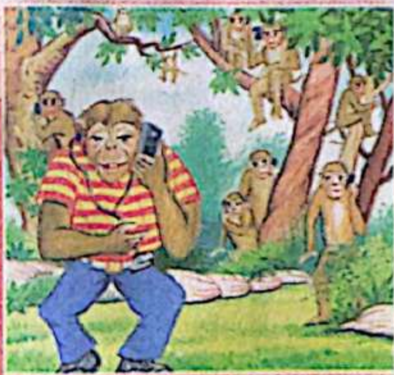
مقاصد ....

....

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 اپریل 2010ء ہے۔

مارچ 2010ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے ہزاروں عنوانات موصول ہوئے، جن میں سے مجلسِ ادارت کو 200 عنوانات پسند آئے اور یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی کتب کے انعامات کے حق دار قرار پائے۔



☆ صباحت العین، گجرات (ٹینشن فری پیکج)
☆ کشف قریشی، بہاول پور (بندروں کو ملا موبائل، بدلا زندگی کا سٹائل)
☆ فرح ناز، کراچی (لو! یہ "بیماری" یہاں بھی پہنچ گئی)
☆ سالکہ ندیم، ملتان (بندر اس دور کے اہل موبائل ہو گئے)
☆ رملہ صدیقی، سرگودھا (سستے نیٹ ورک کا کمال، بندر ہوئے خوش حال)

CamScanner

نبی کریمؐ کی حیاتِ طیبہ سے انتخاب پر مشتمل منفرد اور دلکش سیریز

نبی کریمؐ کی حیاتِ طیبہ بنی نوع انسان کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ آپؐ کے ارشادات، معجزات اور اسوہ، بنی نوع انسان کی دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہیں۔

آپؐ کی دعوت نہ صرف انسانوں کے لیے تھی بلکہ دیگر مخلوقاتِ ارضی بھی ان میں شامل تھے جیسے درخت، جانور اور پتھر وغیرہ۔

اس سیریز میں ان مخلوقات کی نظر سے حیاتِ مبارکہ کا عکس پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سیریز کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کے دلوں میں آپؐ کی محبت اور تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی لگن پیدا ہو۔

یہ سیریز دلچسپ اور آسان پیرائے میں لکھی گئی اور خوبصورت و دلکش تصاویر سے مزین ہے۔

(پہلا سیٹ: ۱ تا ۸)

۱۔ بہادر ہاتھی
۲۔ خوش قسمت گدھا
۳۔ بولتی کنکریاں
۴۔ ذہین چیونٹیاں
۵۔ حضرت عمرؓ اور مکڑیاں
۶۔ جب چاند دو ٹکڑے ہوا
۷۔ طائف میں شہد کی مکھیاں
۸۔ کم سن براق

(دوسرا سیٹ: ۹ تا ۱۶)

۹۔ مکّہ کے مکان
۱۰۔ غار کی فاختائیں
۱۱۔ سراقہ کی گھوڑی
۱۲۔ مقدس اونٹ
۱۳۔ ننھے ہرن
۱۴۔ اُحد کا پہاڑ
۱۵۔ خوف ناک ہوا
۱۶۔ مکّہ کے درخت





فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

CPL NO. 123 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES

The Ultimate HABANERO CHILLI Experience

It's Party for your taste buds!



A Dip Sauce made from a secret blend of finest Habanero Chillies, Rich Ripe Tomatoes, Garlic & Spices.

Shangrila **Garlic Chilli Sauce** a must for your meals.





Takes the Taste...
...to the Limits







www.shangrila.com.pk